جلد:۵، شمارہ:۲
اپریل-جون ۲۰۱۸ء
ISSN : 2394-5567
S.No. 14

دبیر

مدیر
احمد نوید یاسر ازلان حیدر

DABEER
April-June 2018
S.No. 14

ISSN : 2394-5567
S.No. 14
Vol.: 5, Issues : 2
April-June 2018

DABEER

Editor:-
Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

ISSN:- 2394-5567 (UGC No. 47011) S.No. 14

بخواندم یکی مرد هندی دبیر سخن گوی و گوینده و یادگیر

(فردوسیؒ)

دبیر

(بین الاقوامی پیئر ریویوڈ ریفیر یڈ سہ ماہی ادبی و تحقیقی جریدہ)

جلد۔۵ شمارہ۔۲

اپریل۔جون ۲۰۱۸ء

☆ایڈیٹر☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

Mob. no. 09410478973

☆مراسلت کا پتہ☆

دبیر حسن میموریل لائبریری

۱۲۔چودھری محلّہ (جنوبی)، کاکوری، لکھنؤ۔۲۲۶۱۰۱

dabeerpersian@rediffmail.com

☆ریویو کمیٹی☆

پروفیسر آذرمی دخت صفوی، علی گڑھ

پروفیسر شریف حسین قاسمی، دہلی

پروفیسر عبدالقادر جعفری، الہ آباد

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی، لکھنؤ

پروفیسر طاہرہ وحید عباسی، بھوپال

☆مجلس ادارت☆

پروفیسر سید حسن عباس، ڈائرکٹر رضا لائبریری، رامپور

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، ڈائرکٹر آئی پی آر، اے ایم یو، علی گڑھ

پروفیسر علیم اشرف خان، صدر شعبۂ فارسی، ڈی یو، دہلی

پروفیسر سید محمد اصغر، صدر شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، صدر شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل، صدر شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

ڈاکٹر افتخار احمد، صدر شعبۂ فارسی، مولانا آزاد کالج، کلکتہ

ڈاکٹر انجمن بانو صدیقی، شعبہ فارسی، کرامت ڈگری کالج، لکھنؤ

☆معاون مدیر☆

عاطفہ جمال

ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
۱	**اداریہ**	ازلان حیدر	۴
۲	مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں فارسی	ڈاکٹر روبینہ شبنم	۵
۳	مولانا عبدالحئ حسنی کی چند اہم تصنیفات: ایک مطالعہ	ڈاکٹر عائشہ قدسی قدوائی	۱۲
۴	ہندوستان میں فارسی کے طبی آثار	ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں	۱۷
۵	امام صادق: ارشادات وفرمودات کے حوالے سے	ڈاکٹر زہرہ خاتون	۲۳
۶	حنیف نقوی کی تذکراتی تحقیق: شعرائے اردو کے تذکرے	ڈاکٹر مبشرہ صدف	۲۶
۷	داستان نویسی اور کلیلہ ودمنہ	ڈاکٹر سعدیہ جعفری	۳۵
۸	بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی ادبی واجتماعی خدمات	محمد افضل/ڈاکٹر اشتیاق احمد	۴۰
۹	ملا محمود جونپوری	ارمان احمد	۴۸
۱۰	شیخ یعقوب صرفی کی فارسی نعت، قصائد ومنقبت پر ایک اجمالی نظر	افتخار علی جعفری	۵۲
۱۱	رتن سنگھ: ایک ادبی شخصیت	سید تصور مہدی	۵۶
۱۲	شاہ اہل اللہ پھلتیؒ مولف چہار باب: ایک تعارف	اظہار احمد	۵۹
۱۳	فارسی ادب میں حبسیات کی روایت	شفقت حسین	۶۳
☆	**شخصیات**		
۱۴	آزاد ہندوستان کا ایک نامور فارسی محقق: کبیر احمد جائسی	ڈاکٹر مکرم علی	۶۸
☆	**دکنیات**		
۱۵	احوال وآثار اولیائے معروف خلد آباد	کنیز فاطمہ	۷۸
☆	**میراث خطی**		
۱۶	دیوان ہلالی کے اہم خطی نسخوں کا تعارف	آفرین بانو	۸۷
☆	**چشم بینش**		
۱۷	فارسی مثنوی کا ارتقاء: ایک مطالعہ	ڈاکٹر محمد الطاف بٹ	۹۳
۱۸	ارمغان ایران (۲)	ڈاکٹر لیلیٰ عبدی خجستہ	۱۰۰

English Articles:

1	Influence of Arabic on Persian language.....	Abdulla Mulla	3
2	The Origin of Modern Persian Poetry	Abid Ibrahim	10
3	An Islamic Perspective on Free-will	Arshi Naaz	14
4	The Asiatic Society and william jones.....	Shamim Ahmad	19
5	Translation of Indian Literature in Persian	Sk. Kutubuddin	28

اداریہ

امیر حسن دہلوی: امیر حسنؔ وہ بزرگ ہیں کہ خسروؔ بھی جن کے کشتۂ محبت تھے، خلدآباد (اورنگ آباد) میں ان کا مزار ہے، ان کے کلام میں سوز وگداز اس درجہ بھرا ہوا ہے کہ سنتے ہی دل بے اختیار ہو جاتا ہے، مولانا شبلی نعمانی شعرالعجم میں لکھتے ہیں کہ :۔'' جو سوز وگداز، جذبہ واثر ان کے کلام میں موجود ہے ان کے کشتۂ محبت (خسرو) میں بھی نہیں)، اصل یہ ہے کہ سوز وگداز، عاجزی، درد، عجز ونیاز، یہ چیزیں غزل کی جان ہیں اور حسن دہلوی کے یہاں یہ سب کا سب اپنے پورے آب وتاب وجاہ وجلال کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اسکے علاوہ حسنؔ کی غزلوں کی مقبولیت کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ عشاق کے خیالات کو سوز وگداز کے ساتھ ایسے موثر پیرایہ میں بیان کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے واقعات کی تصویر کھنچ جاتی ہے، اور شاعری کا کمال یہی ہے، مثلاً کہنا یہ ہے کہ جو چمن میں پھولوں کی پتیاں پڑی ہوئی نظر آرہی ہیں یہ پتیاں نہیں بلکہ بلبل کا داغدار دل ہے جو خونی کفن پہنے ہوئے بشکل پنبہ چمن میں پڑا ہوا ہے، اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے:۔

برگ گل نیست کہ افتادہ بطرف چمن ست　　پنبۂ داغِ دلِ بلبلِ خونیں کفن ست

بعض وقت عاشق ہجر وفراق سے لاغر ہو جاتا ہے، ایسا لاغر کہ اسکا عدم وجود برابر ہوتا ہے، شاعر اسی مضمون کو نظم کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ ہر چند نالہ پکارتا رہا کہ جسم پیرہن میں ہے، مگر پھر بھی اجل کو میرا پتہ نہ چلا:۔

تنم از ضعف چناں شد کہ اجل جست ونیافت　　نالہ ہر چند نشاں داد کہ در پیرہن ست

پھر اپنے دل سے متوجہ ہو کر کہتے ہیں کہ کہ اے دل تو بہت تنگ ہے کہ مرنے سے ڈرتا ہے حالانکہ یہ مرنا عین زندگی ہے:۔

اے دل تنگ کہ از دادن جاں می ترسی　　مردن اندر نظر دوست بقائے دگر ست

حسنؔ کے کلام میں عاجزی، فروتنی حد درجہ پائی جاتی ہے:۔

مسکیں حسن ز وصل تو گر دید بے نصیب　　با غم قرار دادہ دل بے قرار ما

حال اور وجد سے معلق مولانا رومؒ کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

ایں نفس جاں دامنم برتافتہ ست　　بوئے پیراہانِ یوسفؑ یافتہ ست

حسن دہلوی نے اسی خیال کو ترقی دے کر اس طرح لکھا اور کیا خوب لکھا:۔

پیرہن ہستیم از سر من برکشید　　یوسف من با من ست، من چہ کنم پیرہن

حضرت حسن دہلوی کا تمام دیوان اسی طرح کے اعلیٰ پایہ صوفیانہ اشعار سے بھر پور ہے، حسن دہلوی علیہ رحمہ اپنی زندگی میں اگر کوئی اور کارنامہ نہ بھی انجام دیتے تو بھی ان کے نام کی شہرت اور ذریعہ نجات کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ انہوں سلطان الاولیاء حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کو یکجا کیا اور ان کے مسند خلافت پر سرفراز ہوئے۔

ازلان حیدر

ڈاکٹر روبینہ شبنم
ایسوسیٹ پروفیسر وصدر
نواب شیر محمد خان انسٹی ٹیوٹ
(پنجابی یونیورسٹی) مالیر کوٹلہ (پنجاب)

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں فارسی

چکیدہ: سکھوں کے عہد میں مہاراجا رنجیت سنگھ کا دربار اہل علم کے لئے جاذب توجہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کے علاوہ بعض اچھے ہندو مصنف بھی پیدا ہوئے مثلاً منشی سوہن لال مصنف عمدۃ التواریخ، دیوان امر ناتھ اکبری، پنڈت کاچر (مصنف مجمع التواریخ)، منشی دیا رام در، کرنل مہان سنگھ، دیوان کرپا رام اور دیوان بخت مل سکھوں کے زمانے کا ایک بلند پایہ مصنف تھا۔ ریاست جموں نے بھی ایک دو ہندو مصنف پیدا کیے ہیں جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔ دیوان اجودھیا پرشاد نے بھی وقائع جنگ سکھاں کے نام سے کتاب لکھی ہے۔

کلیدی الفاظ: مہاراجہ رنجیت سنگھ، دربار، فارسی شاعری

گرو گرنتھ صاحب کو گورمکھی پنجابی میں مرتب کئے جانے کے بعد سکھوں کی مذہبی زبان پنجابی قرار پائی اور عوامی زبان بھی پنجابی تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں پنجابی زبان میں تالیف وتصنیف کا سلسلہ چلتا رہا مگر حکومت کا نظام چلانے کے لئے ایسی زبان کی ضرورت پیش آئی جو دفتری اور سرکاری زبان بن سکے۔ چونکہ پنجابی زبان ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں تھی تو مجبوراً انہیں فارسی کو سرکاری زبان بنانا پڑا۔ مسلمان تو اس زبان سے واقف تھے ہی ہندوؤں اور سکھوں کو بھی دفتری ملازمتوں یا کاروباری ضرورت کے درپیش فارسی سیکھنی پڑی۔ اس عہد میں کوئی سکھ مصنف نظر نہیں آتا البتہ ہندو فارسی دان ادیب وشاعر نظر آتے ہیں۔

مال گزاری کا محکمہ ہندوؤں کے قبضے میں تھا جس کی زبان ہندی تھی۔ فارسی پڑھے بغیر ہندوؤں کو با آسانی ملازمت مل جاتی تھی۔ یہ بات یعس بھی سچ ثابت ہوتی ہے کہ جب راجہ ٹوڈرمل نے ہندی کی جگہ فارسی کو دفتری زبان بنا کر اس کو حصولِ ملازمت کے لئے ضروری قرار دیا تو ہندوؤں نے فی الفور فارسی پڑھنی شروع کردی اور تھوڑی ہی مدت میں وہ اس کے اچھے خاصے ماہر ہو گئے۔

یہ بھی نہایت تعجب کا مقام ہے کہ سکھوں میں بہت کم لوگ ایسے نکلے جنہوں نے فارسی زبان میں کچھ کتابیں لکھی ہوں۔ کرنل مہان سنگھ اور چند ایک اور نام تو ملتے ہیں مگر اس قوم میں پنجابی زبان ہی نشر واشاعت کے مراحل طے کر پائی اور فارسی زبان کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی۔ سکھوں نے ابتدائے کار سے ہی پنجابی زبان کو اپنانا شروع کیا اور گرو گرنتھ صاحب کی زبان ہی ان کے نزدیک محبوب ترین زبان رہی۔ مزید برآں سکھ مذہب زیادہ تر پنجاب کی دیہاتی آبادیوں میں پھیلا جہاں اکثر لوگ زراعت پیشہ تھے اور تعلیم سے ان کا زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور فارسی: پنجاب میں سکھوں کی حکومت سلطنت مغلیہ کی ویران بنیادوں پر کھڑی کی گئی تھی اس لیے مہاراجہ رنجیت

سنگھ نے گزشتہ روایات کو بہت حد تک برقرار رکھا۔ مہاراجہ کا دربار ہندو مسلمان اہل علم کا مرجع تھا اور اس سلسلے میں مہاراجہ کی فیاضی کے بہت سے واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔ حکیم عزیز الدین انصاری، فقیر نورالدین، مصر بیلی رام، دیوان امرناتھ اکبری، دیوان دیناناتھ، دیوان گنگا رام وغیرہ اس دربار کے اکابر علما میں سے ہیں۔ دفتری کاروبار فارسی میں انجام پاتا تھا۔ روزنامچے اور واقعات کی مسلیں فارسی میں مرتب ہوتی تھیں۔ اور اسی زبان میں انگریزی حکومت کے ساتھ خط و کتابت بھی ہوتی تھی اور معاہدے لکھے جاتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری، میں جو روزنامچے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت حد تک مغلوں کی وقائع نویسی کے طریقے کو برقرار رکھا گیا ہے۔ سکوں پر فارسی عبارت کندہ ہوتی تھی۔ جسا سنگھ کلال نے اپنے سکوں پر یہ عبارت کندہ کرائی تھی ۔

سکہ زد در جہاں بفضل اکال ملک احمد گرفت جسا کلال

سکھوں کے عہد میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دربار اہل علم کے لئے جاذب توجہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کے علاوہ بعض اچھے ہندو مصنف بھی پیدا ہوئے مثلاً منشی سوہن لال مصنف عمدۃ التواریخ، دیوان امرناتھ اکبری، پنڈت کاچر (مصنف مجمع التواریخ)، منشی دیارام در، کرنل مہان سنگھ، دیوان کرپارام اور دیوان بخت مل جو سکھوں کے زمانے کا ایک بلند پایہ مصنف تھا۔ دیوان اجودھیا پرشاد نے بھی وقائع جنگ سکھاں کے نام سے کتاب لکھی ہے۔

سکھ فوج میں بھرتی ہوتے اور اعلیٰ منصب پاتے۔ ہندو مالیات اور دیوان و دبیر کے عہدوں پر فائض ہوتے۔ مسلمان صنعت وحرفت میں مشغول تھے یا نجی ملازم تھے۔ البتہ توپ خانہ کے نگران اکثر مسلمان تھے۔ مثلاً الٰہی بخش محمد شاہ اور غوثے خان کے نام مشہور ہیں۔ فقیر خاندان کے تین بھائی فقیر عزیز الدین، فقیر نورالدین اور فقیر امام الدین استثناء کی حیثیت رکھتے تھے کہ وہ رنجیت سنگھ کے طبیب، مشیر با تدبیر یا سفیر رہے۔ غلام محی الدین نوشہ ثانی کے یہ تینوں فرزند علم وفضل سے بہرہ ور اور مہاراجا رنجیت سنگھ کے اہم درباری رکن تھے۔

فقیر عزیز الدین: عزیز الدین ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی کے مروجہ علوم احسن طریق پر حاصل کیے۔ طب ایک طرح سے آبائی پیشہ تھا۔ والد بھی اور دادائے مجازی یعنی حکیم عبداللہ انصاری بھی پیشے کے لحاظ سے طبیب تھے۔ عزیز الدین نے لالہ حاکم رائے اور حکیم محمد یار سے علم طب حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر مارٹن سے دواسازی اور کیمیا گری سیکھی۔ ۱۷۹۸ء میں انھوں نے رنجیت سنگھ کی آنکھوں کا علاج کیا جس پر انھیں موضع بادو اور شرقپور انعام میں ملے۔ بعد میں مہاراجہ کو ان پر اتنا اعتماد ہوا کہ دوسرے قدیم وجدید اطباء کی مجوزہ ادویہ ان کے مشورہ کے بغیر استعمال نہیں کرتے تھے۔ لوگ انہیں حاکم مزاج مہاراجہ کہتے تھے۔ آہستہ آہستہ دربار میں ان کا اتنا رسوخ بڑھا کہ وہ مشیر و وزیر ہو گئے۔ مہاراجہ اہم سیاسی امور میں ان سے مشورہ کرتے تھے اور مہمات انجام دینے کے لیے انہیں متعین کرتے تھے۔

۱۸۰۹ء میں انھوں نے مہاراجہ کو انگریزوں کے ساتھ متصادم نہ ہونے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ یہ حکمت عملی بڑی کامیاب رہی۔ انھوں نے انگریزوں کو بھی خوش رکھا اور اپنے ممدوح کے وقار پر بھی حرف نہ آنے دیا۔ جب تک وہ زندہ رہے انگریزوں اور سکھوں کے درمیان مصالحانہ روش قائم رہی۔ ان کی رائے اس قدر صائب تھی کہ انگریزوں کے معاملات میں مہاراجہ ان کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ سکھوں جیسے متبدحکمرانوں کے دربار میں ایک مسلمان وزیر کا اتنا اعتماد تعجب انگیز ہے۔

عزیز الدین کئی مرتبہ سفارتی اور فوجی مہمات پر بھی مامور ہوئے ۱۸۱۰ء میں انہیں صاحب سنگھ بھنگی کا علاقہ ملحق کرنے کے لیے بھیجا گیا ۱۸۱۹ء میں انہیں بھاولپور میں ایلچی بنا کر بھیجا گیا۔ ۱۸۲۶ء میں قلعہ پھلور، دیوان کرپارام سے اپنی تحویل میں لیا۔ ۱۸۳۱ء میں انہیں لارڈ ولیم، بینٹنگ گورنر جنرل کے پاس بھیجا گیا۔ انھوں نے روپڑ کے مقام پر مہاراجہ کے ساتھ اس کی ملاقات کا

انتظام کیا۔

۱۸۳۵ء میں دوست محمد خان کابل سے پشاور پر قبضہ کرنے آیا تو عزیز الدین سفیر بن کر اس کے پاس گئے اور اسے باہمی معاملات پر گفتگو میں مصروف رکھا۔ اتنے میں سکھوں نے دوست محمد کی فوج کو گھیر لیا۔ دوست محمد کو واپس جانا پڑا۔ عزیز الدین کی اس کامیاب سفارت کے بعد واپسی پر انہیں توپوں کی سلامی دی گئی۔

فقیر عزیز الدین نے ۱۸۳۸ء میں لارڈ آکلینڈ سے ملاقات کے وقت روپڑ، لاہور اور امرتسر میں مراسم مہمانداری ادا کیے۔ ۱۸۳۹ء میں وہ مہاراجا کی وفات کے آخری لمحات تک ان کے قریب رہے۔ انھوں نے سکھوں اور انگریزوں کے دوستانہ تعلقات مستحکم اور استوار رکھنے کے لئے کوشش کی۔ سوہن لعل نے صنعت توشیح میں فقیر کی تعریف میں مندرجہ ذیل اشعار لکھے ہیں:۔

عظیم است احسان و اکرام او — زبان قاصر آمد ز ارقام او
یکی ہست در علم و فضل و کمال — ز اقبال آن نوشی ذوالجلال
ادیب و ظریف و سخن پروری — لبیب و عفیف و کرم گستری
دعایش دوای دل درد مند — یگانہ بدانش بہ بینش بلند
نگوئی ازو ہر زمان ظاہر است — جبینش منور ورع باہر است

(انتخاب دفتر دوم از عمدۃ التواریخ، لاہور ۱۸۸۰ء، ص ۶، ۷)

فقیر عزیز الدین شریعت وطریقت کے تمام علوم سے آگاہ تھے۔ اگرچہ بظاہر ہر وقت سرکاری امور کو سرانجام دینے میں مصروف رہتے تھے، پھر بھی ہر وقت ہزار دانہ کی تسبیح ہاتھ میں اور تفسیر، حدیث یا فقہ کی کتاب بغل میں رکھتے تھے۔ فراغت کے وقت مطالعہ کرتے یا عبادت میں مشغول رہتے۔ وہ لوگوں کی درخواستیں مہاراجہ کے سامنے پیش کرتے۔ ان پر احکام حاصل کرتے، اس لیے وہ عوام وخواص کا مرکز تھے۔ عزیز الدین درویش منش تھے اور فقیر دوست۔ وہ روحانی تربیت کے لیے اپنے والد مکرم سے وابستہ رہے۔ انھوں نے حضرت شیخ محی الدین غوث اعظم تک نیا شجرۂ طریقت اپنے روزنامچہ میں درج کیا ہے۔

ایک قصیدے سے ظاہر ہے کہ عزیز الدین اپنے والد کے جانشین ہوئے اور مریدوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ مثلاً:

خلف صدق تو شاہ عزیز الدین — شد بجای تو ثانی ای نوشاہ
دستگیری کند مریدان را — بطفیل تو ثانی ای نوشاہ

فقیر عزیز الدین کی تالیفات حسب ذیل ہیں:

۱۔ دیوان
۲۔ بیاض یا روزنامچہ، نسخۂ خطی لاہور عجائب گھر۔
۳۔ بیاض یا روزنامچہ جلد نہم، نسخۂ خطی، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور

۱۔ دیوان: فقیر عزیز الدین شاعر بھی تھے۔ انھوں نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا۔ فقیر عزیز الدین بظاہر بادشاہ کے درباری کی حیثیت سے سرکاری اور سیاسی امور میں مصروف نظر آتے ہیں لیکن جیسا کہ انھوں نے اپنے نام کے ساتھ فقیر کا لقب اختیار کیا، اسی طرح انھوں نے باطن میں فقیرانہ و درویشانہ انداز قائم رکھا۔ عجز وانکساری شیوۂ زندگی ٹھہرایا۔ غرباء ومساکین سے ہمدردی کی۔ بچوں کے لیے دینی تعلیم کا انتظام کیا۔ خود شرعی علوم پڑھے اور روحانی تربیت بھی حاصل کی۔ ان کی نظر میں شریعت وطریقت ایک کامیاب زندگی کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

شریعت میکند کسب فضایل طریقت میکند قطع رذایل
شریعت از طریقت پر ثمر شد بملکوتش ازین راہ راہبر شد

ان کی داخلی زندگی کا اظہار ان کے اشعار میں ہوتا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ فرصت وفراغت کے لمحوں میں اپنے خیالات کو منظوم کرتے تھے۔ان کی فکر کا موضوع ذہنی طور پر غیر خدا سے جدائی ہے اور اصل حقیقت یعنی خدا سے پیوستگی ہے۔انہیں اپنے فقیر ہونے پر ناز ہے۔ وہ کہتے ہیں:

نہ سلطان نہ وزیرونہ امیرم فقیرم من فقیرم من فقیرم

فقیر ہونے کے حوالے سے وہ جسم وجان کی پاکیزگی کو ضروری سمجھتے ہیں۔وہ یاد خدا سے غافل نہیں ہونا چاہتے:

دمی از یاد تو غافل نباشیم دمی از یاد تو عاطل نباشیم
جو گردد جسم و جانت پاک اطہر بگو از جان و دل اللہ اکبر

فقیر عزیز الدین نظریۂ ہمہ اوست کے قائل ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ہر جگہ اس محبوب حقیقی کے نور کا ظہور ہے۔سب اس کے حسن کے متوالے ہیں اور سب اس سے محبت کرتے ہیں۔اس لیے سب محبت کرنے والوں میں ایک رشتۂ مودت قائم ہے اور ساری دنیا محبت پر استوار ہے۔

وہ فرماتے ہیں؛

ظہور وظاہر ومظہر ہمہ اوست نظور وناظر ومنظر ہمہ اوست

اس لیے:

خدا بین وخداداں وخدا گوی زبان وچشم وگوش از بہر حق شوی

فقیر آزادؔ تخلص کرتے تھے۔انھوں نے قدرت کی طرف سے موزوں طبیعت پائی تھی۔انھوں نے کسی استاد سے شعر و سخن میں فنی تربیت حاصل نہیں کی۔ بظاہر ان کا کلام صنایع وبدایع سے آراستہ نہیں لیکن اس میں استادنہ متانت ہے۔وہ حافظ سے متاثر ہیں۔ان کا قول ہے:

بعد حافظ گر کند دعوی شعر وسخن از جناب حضرت شیراز میگردد خجل

انھوں نے حافظ کے اتباع میں غزلیں لکھی ہیں۔چنانچہ دیوان حافظ کی پہلی غزل کے تتبع میں انھوں نے لکھا ہے:

الا یاایھا الکافی بدہ آرام دردلھا کہ از فضل تو میگردد یکدم حل مشکلھا

انھوں نے غزل،قصیدہ اور مثنوی میں طبع آزمائی کی ہے۔کیوں کہ ان کا دیوان موجود نہیں اس لیے ان کا وہی کلام دیکھا جا سکتا ہے جو ان کے روزنامچوں میں درج ہے۔

'آزاد نامہ' کے عنوان سے ان کی ایک مختصر مثنوی ہے جس میں تصوف واخلاق کے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ شروع میں بیس تیس اشعار میں خیال کی کارفرمائیوں پر اشعار لکھے ہیں۔ان میں سے چند پیش خدمت ہیں تا کہ ان کی فکر ونظر کا اندازہ ہو سکے۔

خیالی می برد بر فوق افلاک خیالی می رساند در تہ خاک
خیالی میکند از خویش بیزار خیالی میکند ہر کار بیکار

۱۔روزنامچہ فقیر عزیز الدین: اس جلد کی حیثیت ایک بیاض کی ہے۔ اس بیاض میں ان خطوط کی نقول موجود ہیں جو دوسروں نے فقیر

عزیز الدین کو لکھے۔عموماً انہیں ذیل کے القاب سے مخاطب کیا گیا ہے۔حقائق آگاہ،فضائل کمالات دستگاہ،حکمت و فراست پناہ

۔

تجزیاتی مطالعہ سے فقیر عزیز الدین کی شخصی زندگی کے متعلق مستند معلومات حاصل ہوتی ہیں اور رنجیت سنگھ کے عہد میں تعلیمی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی شعبوں سے متعلق امور پر روشنی پڑتی ہے۔سیاسی نوعیت کے خطوط اور دوسری تحریروں کی معلومات بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

۲۔روزنامچہ فقیر عزیز الدین نہم: اس روزنامچہ میں آستانہ شریف میں جو دینی مدرسہ قائم تھا اس کے متعلق کافی تفصیلات محفوظ ہیں۔ طلبہ کی تعداد،ان کے درس کی تفصیل،انفرادی طور پر ہر طالب علم کے درس کی تفصیل کہ وہ کہاں تک مطالعہ کر چکا ہے وغیرہ۔

فقیر نورالدین منور: نورالدین، غلام محی الدین نوشہ ثانی کے تیسرے بیٹے تھے۔پہلے دو بیٹوں کے نام عزیز الدین اور امام الدین تھے۔تینوں بھائی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار سے وابستہ تھے اور کسی نہ کسی حیثیت سے صاحب اثر و رسوخ تھے۔عمدۃ التواریخ میں نورالدین کو عموماً خلیفہ نورالدین لکھا گیا ہے۔وہ اپنے والد کے جانشین ہوئے کیوں کہ صورت و سیرت میں ان سے خاص مناسبت رکھتے تھے۔حاجی نوشہ بانی سلسلۂ نوشاہیہ کی الفی اور کلاہ جو غلام محمد چٹھا کے خاندان سے دستیاب ہوئی تھی،انہیں بھی ان کے حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

نورالدین ۱۸۱۰ء میں اپنے بڑے بھائی عزیز الدین کے توسط سے دربار میں پہنچے اور ضلع اجودھن کے نگران مقرر ہوئے۔پھر گجرات کے صوبیدار متعین ہوئے۔راجہ سلطان خان بھنیر یہ کی سرکشی کو نرم کیا اور اس سے دس ہزار روپے نذرانہ کے طور پر لاہور بھیجے جس پر مہاراجہ بہت خوش ہوا۔ ۱۸۱۴ء میں جالندھر کے فوجدار مقرر ہوئے۔انھوں نے جالندھر سے تین لاکھ روپیہ آمدن کی رقم پیش کی۔اس سے پہلے وہاں کی آمدن ایک لاکھ اور چند ہزار ہوا کرتی تھی ۔۱۸۱۳ء میں سیالکوٹ، ڈسکہ بالووال اور وزیر آباد بھی ان کے زیر حکومت کر دیے گئے ۔۱۸۱۸ء میں انھیں لاہور بلا کر دربار سے متعلق فرائض سپرد کیے گئے ۔۱۸۱۵ء میں ان کو بھیہ رام سنگھ کے پاس بھیجا گیا تا کہ فوج کے ہمراہ شاہی علاقوں کا انتظام کریں ۔۱۸۱۶ء کو وہ ملک رام گھڑیہ کے بندوبست کے لیے مامور ہوئے۔وہ بھاگ سنگھ برادر دیوان حکماں سنگھ کے ساتھ گئے تا کہ فصل خریف کا بقایا وصول کریں۔۱۸۲۶ء میں انھیں پنڈ دادن خان مسخر کرنے کے لیے بھیجا گیا۔۱۸۳۱ء میں نظم ونسق میں امداد کے لیے راجا گلاب سنگھ کے پاس سید پور اور مکھڑ بھیجا گیا۔۱۸۲۵ء میں انھیں سردار بدھ سنگھ کے ہمراہ ستلج پار جگراؤں کا انتظام کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔

لاہور میں قلعہ کی تعمیر و مرمت، دیگر عمارات کی ساخت پرداخت، باغات کی تشکیل و نگہداشت ان کے سپرد تھی۔

مہاراجا کو نورالدین پر بڑا اعتماد تھا۔موتی سندر میں خزانہ کی چابیاں ان کے پاس رہتی تھی۔

نورالدین ایک مطلق العنان غیر مسلم بادشاہ کے مشیر و وزیر ہوتے ہوئے اور رسوخ و اقتدار رکھنے کے باوجود فقیر منش اور متواضع تھے۔دوسروں کی حاجت برآری کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔سوہن لعل نے صنعت توشیح کو برقرار رکھتے ہوئے ان کی تعریف میں مندرجہ ذیل اشعار لکھے ہیں:

نکتہ فہم و صاحب علم و ذکا　　واثق آمد او از جملہ در عطا
روز و شب در یاد نوشہ ھادی است　　از عنایتہاش ہر دم شادی است

(انتخاب دفتر روم عمدۃ التواریخ،سوھن لعل،لاھور صفحہ ۷)

دیوان منور: دیوان کے مندرجات سے ظاہر ہے کہ منور نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ان میں ہر

صنف سخن میں شعر موزوں کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ آسان عربی میں بھی شعر موزوں کر لیتے ہیں ان کے تمام دیوان کا موضوع مناجات، لغت منقبت آئمہ واہل بیت، مدح غوث اعظم اور مرشد نوشہ ثانی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شعر کہنے سے مقصود اظہار عقیدت وارادت ہے۔ وہ سوز واخلاص سے تعریف کرتے ہیں اور اپنے دکھ درد میں ان سے مدد مانگتے ہیں۔ جس طرح خدا سے مدد مانگتے ہیں اسی طرح شہ نجف اور شہ بغداد اور شہ کربلا سے مدد مانگتے ہیں۔

وہ نبی اکرم کو شافع سمجھتے ہیں اور حضرت حسین کو بھی۔ آخرت میں اپنی نجات کا ذریعہ حب اہل بیت کو ہی سمجھتے ہیں۔

منور کے والد حضرت غلام محی الدین، نوشہ ثانی کے لقب سے معروف تھے۔ وہ چونکہ ان کے روحانی مرشد تھے اس لیے سید جیلانی کے بعد انھوں نے نوشہ ثانی کی تعریف کی ہے۔

مدح ومنقبت اور دعائیہ موضوعات کے علاوہ بعض اشعار میں ایسے عقائد وافکار کا بھی اظہار ہو گیا ہے جن سے ان کی شخصیت وکردار پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ بڑے مرنجان مرنج قسم کے آدمی تھے۔ بظاہر ریاست وامارت حاصل تھی لیکن اندر سے فقیر و درویش تھے۔ صبر وقناعت سے زندگی گزارتے تھے۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ عفو ودرگذران کا شعار تھا۔ زبان پر برا کلمہ لانا بھی انھیں گوارا نہیں تھا۔

☆ کہ ناید زمن ھیچکس را گزند زپا و زدست وز چشم و زبان

☆ اگر بر عیب کس آگاہ گردی ترا گویم ترا می پوش می پوش

(صفحہ۔۱۲۲)

زندگی کے متعلق ان کا نظریہ خوش آیند ہے۔ وہ مغموم وملول نہیں رہنا چاہتے۔ وہ دوسروں کو بھی خوش وخرم رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

فقیر نورالدین کی زندگی میں جنگ وجدل اور کشت وخون کے ہزاروں واقعات رونما ہوئے۔ انھوں نے حوادث دوراں اور انقلابات زماں کے عبرتناک مناظر دیکھے۔ تخت حاصل کرنے کے لیے خونیں داستانیں دہرائی گئیں لیکن ان کے کلام میں اپنے ماحول ومحیط کے متعلق کوئی تاثر موجود نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تنہائیوں میں بیٹھ کر اپنی موزوں طبیعت کو حمد ومنقبت میں مصروف رکھتے تھے۔ صرف ایک جگہ پنجاب میں امن وامان اور عوام کی خوش حالی کا ذکر کیا ہے:

صباح الخیر از غیبم ندا شد صلای عام شد از بہر پنجاب

بمہر امن از نیرنگی دھر کہ خوش بی غم نماید ھر یکی خواب

منور، سعدی، حافظ، بیدل اور صائب سے متاثر ہیں۔ ان کی غزلوں کے تتبع میں غزلیں لکھی ہیں۔ چونکہ موضوع محدود ہے اس لیے تتبع بحر وقافیہ تک محدود رہا ہے۔ کہیں کہیں صنایع لفظی ومعنوی لانے کا بھی اہتمام کیا ہے۔ اسلوب بیان مستقیم ورواں ہے۔ چونکہ موضوع میں عقیدت شامل ہے اس لیے احساسات میں اخلاص ہے۔ بعض غزلیں موسیقی کا آہنگ لیے ہوئے ہیں۔

تاریخ کوہ نور: اس تاریخچہ کے مرتب اور اس کی اشاعت کے مہتمم ڈاکٹر محمد باقر نے وی۔ بال کی انگریزی زبان میں مرتبہ تاریخ کوہ نور کا خلاصہ ضمیمے کے طور پر شائع کر دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوہ نور، کولور کی کانوں سے ملا تھا اور میر جملہ نے شاہ جہاں کو پیش کیا تھا۔

رسالہ کیفیت تبرکات زاکیات: تبرکات میں حضرت رسول اکرمؐ، حضرت علی، فاطمہ زہرا، حضرت حسین، غوث الاعظم اور اویس قرنی سے منسوب اشیاء شامل ہیں۔ صفحہ۴ سے ۱۱ تک ان اشیاء کے حصول کی روئداد بیان کی ہے۔

فقیرامام الدین: سید غلام محی الدین شاہ نوشہ ثانی کے منجھلے بیٹے تھے۔ دوسرے دو مشہور بیٹے فقیر عزیز الدین اور فقیر نورالدین تھے جو مہاراجا رنجیت سنگھ کے دربار میں معزز عہدوں پر سرفراز تھے اور مقربین میں شمار ہوتے تھے۔ جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ بڑے بھائی فقیر عزیز الدین ہی امام الدین کو دربار کی ملازمت میں لائے۔ فقیر امام الدین کی زندگی کے احوال وکوائف سے متعلق بہت کم معلومات فراہم ہوسکی ہیں۔ ۱۲۴۴ھ۔۱۸۲۸ء میں ستلج پار کا علاقہ دوہنی جو سدا کور کے تصرف میں تھا، انگریزوں نے مہاراجا رنجیت سنگھ کو واپس کر دیا۔ فقیر امام الدین اس کی تحویل کے لیے وہاں گئے۔ امام الدین قلعہ گوبند گڑھ، خزانۂ خاص، توشہ خانہ اور مال وزن کے تحویلدار تھے۔ دو ہزار آدمی اس کی حفاظت کے لیے مقرر تھے، اور تمام زندگی یہ خدمت ان کے سپرد رہی اور امرتسر سے متعلق مقدمات بھی وہی طے کرتے تھے۔ اسکے علاوہ، متفرق کاموں پر بھی مامور کئے جاتے تھے۔ رام باغ امرتسر کی آرائش کا کام بھی ان کے ذمے تھا۔ بعض جشنوں مثلاً دسہرہ کی تیاری کے لیے بھی انہیں رقوم دی جاتی تھیں۔ شالا مار باغ تک شاہ نہر کا پانی پہنچانے کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد ہوئی۔

فقیر امام الدین دوسرے بھائیوں کی طرح 'متواضع' خوش اخلاق اور کامیاب سفیر تھے۔ وہ ۱۸۴۴ء میں فوت ہوئے۔

وہ شعر موزوں کر لیتے تھے اور اظہرؔ تخلص کرتے تھے۔ ابھی تک ان کا کلام دستیاب نہیں ہوا۔ قلندر شاہ لاہوری نے ایک شعر میں انہیں جواب لکھنے کی دعوت دی ہے۔

از امام الدین اظہر چشم می دارم جواب	با دو صد شوخی قلندر سر زد از طبعم غزل

یہ ان سینکڑوں ادیبوں اور شاعروں میں سے تین برادران کا محض تعارفی تذکرہ ہے جو اس عہد میں فارسی شعروادب کی آبیاری کرنے میں مصروف تھے کہ اگر ان کے نام شمار کئے جائیں تو یہ فہرست بہت طویل ہوگی۔

☆☆☆

ڈاکٹر عائشہ قدسی قدوائی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ عربی
کرامت حسین گرلس پی۔جی کالج
لکھنؤ

مولانا سید عبدالحئ حسنی کی چند اہم تصنیفات: ایک مطالعہ

چکیدہ: زائد از ہزار سال سرزمین ہند کی فضا دیگر زبانوں کے ساتھ عربی و فارسی علوم و آداب سے آراستہ ہے۔ اس عرصے میں انگنت پھولوں سے مشک بار علوم و فنون کے چمن وجود میں آئے، جن کی مہک آج بھی مشامِ جاں کو معطر کیے ہوئے ہے۔ ان حوصلہ مند علماء نے علوم و آداب کی ایسی روشنی پھیلادی تھی کہ شام غریباں میں بھی بزم چراغاں کا دھوکہ ہوتا تھا، ان پاکیزہ نفوس پر مشتمل قافلے کا فرد دور اندیش، عزم و حمیت کا پیکر، برصغیر ہند و پاک کی تیرہ سو سالہ علمی و ادبی، ثقافتی و معاشرتی، اسلامی تاریخ قلم بند کرنے کا حوصلہ کرتا ہے، کیونکہ اس کی نظر ثاقب نے مشاہدہ کر لیا تھا کہ مغربی تہذیب و تعلیم کی چکاچوند اور قدیم و جدید کی کشمکش اور حکومتوں و ثقافتوں کے انقلاب نے مسلمانوں کو ایسا مشغول کر دیا ہے کہ انہیں اپنا خوب صورت اور شان دار ماضی تک دیکھنے کی فرصت نہیں۔ ایسے میں ملت کے اس دردمند و بہی خواہ کو توفیق الٰہی ہوتی ہے کہ ثقافتوں کے بدلتے موسم میں عظمت رفتہ کی تاریخ محفوظ کر لے اور اس موسم خزاں میں گزشتہ داستان بہار کو رقم کر لے اس سے پہلے انقلاب زمانہ کے تند و تیز جھونکے ان اوراق کو اڑا لے جائیں۔

کلیدی الفاظ: نظر ثاقب، مشام جاں، گل سرسبد، مہر جہانتاب، تلخیص الاخبار، جوئے شیر، تدبیر منزل، تقلید حریری، نزھۃ الخواطر، نعم الخلف۔

ہندوستان کے کوہ و دمن اور دشت و چمن نے کبھی آرین کا دل لبھایا تو کبھی عرب کے شہسواروں کے خوابوں کی تعبیر بنے اور کبھی ایرانی طالع آزماؤں کا مسکن بنے۔ ان سب نے اپنے ساتھ لائے ہوئے تمدن و ثقافت، علم و فن کے تحفے اس نئی سرزمین کے حوالے کیے۔ زائد از ہزار سال سرزمین ہند کی فضا دیگر زبانوں کے ساتھ عربی و فارسی علوم و آداب سے آراستہ ہے۔ اس عرصے میں انگنت پھولوں سے مشک بار علوم و فنون کے چمن وجود میں آئے، جن کی مہک آج بھی مشامِ جاں کو معطر کیے ہوئے ہے۔ ان ہی میں ایک نمایاں گل سرسبد ہے جسے دنیا سید عبدالحی حسنی کے نام سے پہچانتی ہے جو علمائے سلف کے لئے بمنزلہ نعم الخلف ہے۔ مولانا سید عبدالحی کا سفر حیات ۲۲ر دسمبر ۱۸۶۹ء سے شروع ہو کر ۳ر فروری ۱۹۲۳ء کو تمام ہوا۔ ان کی جائے پیدائش دائرہ شاہ علم اللہ بیرون شہر رائے بریلی ہے جو لکھنؤ سے متصل ہے لیکن زمانۂ طالب علمی اور باقی زندگی لکھنؤ میں گزری۔ مولانا حسنی کا عہد پورے ہندوستان کے لیے انتہائی رستخیز تھا۔ دہلی کے لال قلعہ و قطب مینار ہزار سالہ افق ہند پر تاباں رہنے والے مہر کے غروب ہونے پر نوحہ خواں تھے۔ استعماری حکومت کے پنجۂ ستم میں سارا ملک شفق رنگ تھا۔ انگریزی حکومت کے ظلم و استبداد کی کہانی ملک کا گوشہ گوشہ بیان کر رہا تھا۔ دوسری طرف ہندوستانی مسلمان قدیم و جدید، مشرق و مغرب کی کشاکش میں مبتلا تھے، یا علامہ ابوالحسن علی حسنی ندوی کے لفظوں میں

''یہ دوتہذیبوں، دوتعلیمی نظاموں اور زندگی کے دوفلسفوں کے تبادلے اور دوموسموں اور فصلوں کے تداخل کا زمانہ تھا۔ایک موسم کے چل چلاؤ اور دوسرے موسم کی آمد آمد کے مشترک زمانہ میں مزاجوں میں جو ناپایداری، صحت کے نظام میں جو اختلال اور طبیعتوں میں جو بے یقینی اور بے ثباتی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ اس معنوی عزل ونصب اور آمد ورفت کے مواقع پر پیدا ہونا لازمی تھی.....ایک بڑھتے ہوئے اقتدار کا نیم دلی بلکہ بددلی کے ساتھ استقبال، دوسرے ختم ہوتے ہوئے اقتدار وعہد کو شکستہ دلی اور مجبوری اور ناگورای کے ساتھ الوداع کہنے کی تیاری، بدلے ہوئے حالات کا مجروح دل اور اشک آلود آنکھوں سے جائزہ لینا اور نئے حالات کے چوکھٹے میں چارو ناچار اپنے کو فٹ کرنے کی کوشش کرنا اس عہد کا ایک نمایاں پہلو تھا۔''(حیات عبدالحی ،ص:۵۳۔۵۴)

ایسے پُر آشوب دور میں دوراندیش، غیوراور باحمیت علمائے کرام کی قوت دفاعی متحرک ہوجاتی ہے اور بقدر استطاعت جس سے جو بن پڑتا ہے وہ انجام دیتا ہے اور بقول علامہ ابوالحسن ''مسلمانوں کے دینی، علمی، اخلاقی اور تہذیبی اثرات کے چراغ کی روشنی مدھم پڑ جانے کو باوجود گل نہیں ہوئی تھی، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ چراغ گل ہونے سے پہلے جس طرح بھڑک اٹھتا ہے، اس کی روشنی اس پھیلتے ہوئے اندھیرے کا زیادہ ہمت وعزم کے ساتھ مقابلہ کررہی تھی، اور ذی شعور وباعزت وجود کی طرح تیل کا ذخیرہ ختم ہوجانے اور فتیلے کے جل جانے کی کمزوری کو چھپارہی تھی۔(حیات عبدالحی ،ص:۵۳۔۵۴)

حوصلہ مند علماء نے علوم وآداب کی ایسی روشنی پھیلا دی تھی کہ شام غریبا میں بھی بزم چراغاں کا دھوکہ ہوتا تھا، ان پاکیزہ نفوس پر مشتمل قافلے کا فرد دوراندیش، عزم وحمیت کا پیکر، برصغیر ہندوپاک کی تیرہ سوسالہ علمی وادبی، ثقافتی ومعاشرتی، اسلامی تاریخ قلم بند کرنے کا حوصلہ کرتا ہے، کیونکہ اس کی نظر ثاقب نے مشاہدہ کرلیا تھا کہ مغربی تہذیب وتعلیم کی چکاچوند اور قدیم وجدید کی کشمکش اور حکومتوں وثقافتوں کے انقلاب نے مسلمانوں کو ایسا مشغول کردیا ہے کہ انہیں اپنا خوب صورت اور شان دار ماضی تک دیکھنے کی فرصت نہیں۔ایسے میں ملت کے اس دردمند وبہی خواہ کو توفیق الٰہی ہوتی ہے کہ ثقافتوں کے بدلتے موسم میں عظمت رفتہ کی تاریخ محفوظ کرلے اور اس موسم خزاں میں گزشتہ داستان بہار کو رقم کرلے اس سے پہلے انقلاب زمانہ کے تند وتیز جھونکے ان اوراق کو اڑا لے جائیں۔

ادب کا ذوق مولانا سید عبدالحی کو ورثے میں ملا تھا کیونکہ آپ کے والد ماجد حکیم سید فخرالدین صاحب مہر جہانتاب فارسی ادب میں بلند پایہ اور اہم مقام رکھتے تھے۔ یہ فطری ذوق مولانا کو حصول علم وادب کے لیے مسلسل مہمیز کرتا رہا۔ چناچہ انہوں نے ہندوستان کے مختلف علمی مراکز کے اسفار کئے اور متعدد ذاتی اور سرکاری کتب خانوں کی خاک چھانی، یہاں تک کہ مولانا کو عربی وفارسی اور اردو تینوں زبانوں کے ادب میں یدطولیٰ حاصل ہوگیا۔

اس مقالے میں ہم مولانا سید عبدالحی کی عربی کتابوں کا مختصر تعارف وجائزہ پیش کررہے ہیں۔

۱۔**نزھۃ الخواطر وبھجۃ المسامع والنواظر**: یہ کتابیں اتنی سلیس وشگفتہ عربی میں ہے کہ علامہ ابوالحسن جو عرب دنیا میں اپنی عربی دانی کے لیے مشہور ہیں بے ساختہ لکھتے ہیں ''وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی پوری ہزار سالہ علمی تاریخ میں ایسی سلیس وشگفتہ عربی زبان لکھنے والا (ہمارے علم میں) نہیں گزرا۔(حیات عبدالحی)

نیز متعدد مشہور عرب مبصرین وناقدین نے مولانا عبدالحی کی انشاپردازی اور عربی تحریر کو سراہا ہے مثال کے طور پر علامہ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی اور علی طنطاوی مولانا کی خوبیٔ تحریر کے قائل تھے۔

یہ معرکۃ الآراء تصنیف آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ برصغیر ہندوپاک کے علمی وادبی وثقافتی حالات سے متعلق ایک ایسا انسائیکلوپیڈیا ہے جس سے کوئی بھی محقق علمی وثقافتی تحقیق کے سلسلے میں صرف نظر نہیں کرسکتا ہے۔ یہ شاہ کار تصنیف ہندوستان میں آمد

اسلام سے لے کر مصنف کے زمانے تک شعراء وادباء، امراء وسلاطین، غزاۃ وفاتحین، علماء وفضلاء، شیوخ وصوفیہ اور اطباء ومشاہیر کے تراجم وحالات پر مشتمل ہے، ان تراجم کی تعداد ساڑھے چار ہزار سے زائد ہے۔ اس کتاب کے سلسلے میں طلبِ ذوق مولانا کو ہندوستان میں کشاں کشاں لے کر پھرا۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان کی اس سرحد سے اس سرحد تک کوئی کتب خانہ نہیں چھوڑا، پورے بیس برس کی مسلسل کاوشوں کے بعد یہ ضخیم مجموعہ تیار ہوا۔ بلاشبہ یہ کتاب ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا سب سے وسیع اور جامع تذکرہ ہے جو کسی خاص زمانے یا خاص فرقے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اس میں مصنف نے اپنے علمی تنوع کے ساتھ علمی رواداری اور فراخ دلی کی بہترین مثال قائم کردی ہے۔ انہوں نے اپنی معیاری تاریخ میں کسی طرح کی عصبیت اور فرقہ بندی کو قطعاً جگہ نہیں دی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں ہر طبقے اور صنف کی نمایاں شخصیات شانہ بہ شانہ نظر آتی ہیں۔ مصنف کی علمی رواداری کا روشن پہلو یہ بھی ہے کہ علم وفضل میں ممتاز خواتین کا بھی تذکرہ موجود ہے۔ ہندوستان کے اسلامی عہد سے متعلق یہ کتاب اتنی جامع اور محیط ہے کہ اس موضوع پر گویا یہ ایک لغت ہے جس میں طلبائے علم وتحقیق کو سہولت کے ساتھ کارآمد مواد حاصل ہوجاتا ہے، سنین اور اہم تصانیف کے نام بآسانی مل جاتے ہیں۔

اس کتاب کا وصف امتیازی یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف نے ابن خلکان کا طرز اپناتے ہوئے نہایت حسن وخوبی سے مذکورہ شخصیت کی نمایاں صفات ابتدائی الفاظ میں ذکر کردی ہیں۔ مثلاً علامہ نظام الدین محمد سہالوی ثم فرنگی محلی جن کو درس نظامی کے بانی کی حیثیت سے عالمگیر شہرت حاصل ہے، ان کا تذکرہ ان الفاظ سے کرتے ہیں:

''الشیخ الامام، العالم الکبیر، العلامۃ الشھیر، صاحب العلم والفنون وغیث الافادۃ الھتون، العالم الربع المسکون، أستاذ الأساتذۃ وامام الجھابذۃ''

ان القاب واوصاف میں مصنف نے علامہ فرنگی محلی کا تعارف جو جامع علوم وکمالات تھے بڑی مؤرخانہ دیدہ وری کے ساتھ کیا ہے کہ یہ القاب ان کے تمام اوصاف وکمالات کا عنوان معلوم ہوتے ہیں اور یہی امتیازی وصف مولانا عبدالحی نے اپنی مایہ ناز تصنیف میں از ابتدا تا آخر اختیار کیا ہے۔

مصنف علام نے اس کتاب میں سلیس وشستہ عربی زبان استعمال کی ہے جب کہ ان کے عہد میں ہندوستان میں ایسے نمونے نہیں ملتے ہیں بلکہ تقلید حریری عام تھی، عربی عبارت سجع وقافیہ کی بندشوں سے بوجھل تھی۔ ''نزہۃ الخواطر'' کی آٹھویں جلد جو مولانا کے معاصرین پر مشتمل ہے اس میں ان کی خوبیٔ تحریر اور انشا پردازی پوری طرح سے جلوہ گر ہے کیونکہ اس میں انہوں نے مواد کے بجائے براہ راست مشاہدے سے اخذ کیا ہے اور قلم روایت کی بندشوں سے آزاد ہے۔ چنانچہ اس جلد میں زندگی کی رمق ودل آویزی نظر آتی ہے۔ مصنف نے اپنے معاصرین کے شمائل واخلاق، عادات واطوار اور وصف وسراپا کی کامیاب تصویر بہترین زبان وبیان میں کھینچی ہے جس میں کسی طرح کے بوجھل پن یا اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا بلکہ قاری کو ایک کشش محسوس ہوتی ہے جو اس کو مزید پڑھنے پر ابھارتی رہتی ہے۔ یقیناً جب تک لکھنے والے کو زبان وبیان پر مکمل طور سے مہارت وکمال نہ حاصل ہو اس وقت تک وہ کامیاب تذکرہ نگاری سے قاصر رہے گا۔

۲۔ **الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند**: یہ کتاب بھی عربی زبان میں ہے اس میں مولانا عبدالحی نے ہندوستان میں ہزار سالہ اسلامی علمی تاریخ کو محفوظ کردیا ہے۔ یعنی علم وتعلیم کی تاریخ، نصاب درس کے ارتقاء اور اس کی عہد بعہد تبدیلیوں کی روداد مرتب کی ہے۔ اس کتاب کے تعارف میں آپ کے فرزند ارجمند مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی لکھتے ہیں ''ہندوستان کے ہزار سالہ اسلامی عہد کے تصنیفی کام کا مفصل ومکمل جائزہ لینا فرہاد کے کام کی طرح پہاڑ کا جگر کاٹ کر جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔'' (حیات عبدالحی،

ص: ۳۲۰) اس کتاب کا مقدمہ بہت جامع اور اہم ہے جس میں مصنف نے نصاب تعلیم کی تاریخ پیش کی ہے، علاوہ ازیں زمانے کے ساتھ اس نظام میں جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ان سب پر روشنی ڈالی ہے۔ قدیم زمانے میں تعلیم کا جو نظام تھا اس کا مکمل خاکہ پیش کیا ہے، نظام تعلیم میں پیدا ہونے والے تغیرات کے اسباب پر بحث کی ہے، ہر دور میں جو علم معیار فضیلت رہا ہے اس کی نشاندہی کی ہے۔

۳۔ **الھند فی العھد الاسلامی:** یہ بھی عربی زبان میں ہے۔ اس کا تعلق تین فنون سے ہے۔ یعنی اول فن جغرافیۂ ہند۔ فن ثانی تاریخ۔ اور فن ثالث خطط و آثار۔ فن جغرافیہ کے بارے میں قدیم و جدید تاریخ و مذہبی و تمدنی حیثیتوں سے ہندوستان کو لیا گیا ہے۔ یہ باب اپنی معلومات کے اعتبار سے مکمل ہے۔ اتنا جامع تذکرہ کسی دوسری کتاب میں ملنا دشوار ہے۔ تاریخ کا باب ہندوستان کے اسلامی حکمراں خاندانوں پر مشتمل ہے۔ تمام حکمراں طبقات کا تذکرہ اس میں موجود ہے، یہ تاریخ مجتہدانہ طرز پر لکھی گئی ہے، تاریخ اغلاط جو مشہور ہیں ان کی گرفت کی ہے۔

اس کتاب کا تیسرا حصہ بہت دلچسپ اور نئی چیز ہے یعنی مسلمانوں کے دور حکومت میں جو ترقیاں ہوئیں، مسلمان امراء و سلاطین کے زیر سرپرستی جو ایجادات و اختراعات ہوئیں ان کا تذکرہ ہے۔ فن تعمیر و ترقی سے متعلق قیمتی معلومات ہیں اس باب میں مصنف نے مسلمانوں کے تمدن و ثقافت، طرز معاشرت اور اس کی تبدیلیوں، اسلامی حکمرانوں کے عہد بعہد کے رسوم و رواج، اس زمانے کے محاصل و خراج اور طریق حکومت پر بڑی باریک بینی سے بحث کی ہے۔ یہ باب بھی اتنا جامع اور پُر از معلومات ہے جو کتب خانوں کی نیابت کرتا ہے۔

۴۔ **تلخیص الاخبار:** یہ منتخب احادیث کا مجموعہ ہے جن کا تعلق حسن معاشرت، تہذیب اخلاق، سیاست، تمدن اور تدبیر منزل سے ہے۔

۵۔ منتھی الافکار فی شرح تلخیص الاخبار: یہ تلخیص الاخبار کی عربی شرح ہے جس میں مختلف فیہ مسائل کو نہایت خوش اسلوبی سے سلجھایا ہے۔

۶۔ شرح سبعۃ معلقہ: یہ بھی عربی میں ہے اور ابھی غیر مطبوعہ ہے۔

۷۔ ریحانۃ الادب وشمامۃ الطرب: یہ عربی قواعد سے متعلق ہے اس میں مصنف نے صرف و نحو کی تعلیم جدید استقرائی اصول سے دی ہے لیکن افسوس یہ غیر مطبوعہ ہے۔

۸۔ **گل رعنا:** مولانا سید عبدالحئ نے اپنی عربی تصنیفات ''نزھۃ الخواطر''، ''معارف العوارف''، اور ''جنۃ المشرق'' کی تالیف اور ترتیب کے سلسلے میں ھندوستان کی سیاسی، تمدنی، علمی اور ادبی تاریخ کا وسیع مطالعہ کیا تھا اور اس تعلق سے سیکڑوں کتابوں اور مضامین کا مطالعہ کیا اور اس طرح ضروری اور غیر ضروری بہت سا مواد نظر سے گزرا جسمیں اردو زبان و ادب کی تاریخ اور اسکے ابتدائی مراحل بطور خاص تاریخ و شعر و شاعری اور شعراء کے احوال زندگی اور کمالات وغیرہ شامل ہیں جس سے اردو شعر و شاعری کی تاریخ مرتب کرنے میں بیش بہا مدد ملی چنانچہ اردو زبان میں اردو شعر و شاعری کی تاریخ اور شعراء کے حالات زندگی ''آب حیات'' مرتبہ مولوی محمد حسین آزاد کے بعد ''گل رعنا'' کے نام سے آپ کے قلم صدق نگار سے منظر عام پر آئی۔

اردو شعراء کے تذکرے ۱۸۸۷ء تک فارسی میں لکھے گئے۔ یہ سب تذکرے اردو شاعری کے خط و خال اور اسکی امتیازی خصوصیات کو ظاہر کرنے کے لئے لکھے گئے اور شعرا کے تمام تر اردو کلام کا ہی نمونہ پیش کیا گیا ہے لیکن ان تمام تذکروں کی زبان فارسی ہی تھی چنانچہ میر تقی میرؔ کی ''نکات الشعراء'' اور میر حسن اور مصحفی کے تذکرے اور خود مولانا عبدالحئ کے والد حکیم فخر الدین حسنی کے

معرکۃ الآرا تصنیف ''مہر جاں تاب'' بھی فارسی زبان میں تھی۔

مولوی محمد حسین آزاد کی تصنیف ''آب حیات'' کو یہ اولیت حاصل ہے کہ پہلی مرتبہ انہوں نے اردو والوں کو اردو شاعری کی کہانی اردو میں سنائی لیکن جیسا کہ کوئی علمی و تحقیقی کاوش حرف آخر نہیں ہوسکتی اسی طرح تنقیدی زاویے سے ''آب حیات'' میں بہت سے پہلو تشنہ بھی رہ گئے تھے جو مورخ عبدالحئ کی نظر میں کھٹک رہے تھے۔آب حیات میں بہت سی چیزیں تھیں جو انکے تاریخی ذوق کے خلاف تھیں چنانچہ وہ تاریخی اغلاط جو نادانستہ طور پر آب حیات میں آ گئی تھی انکی تصحیح گل رعنا سے ہوگئی۔اردو زبان اور شاعری کے آغاز کو وہ آب حیات اور دوسرے قدیم تذکروں سے کئی قدم پیچھے لے گئے ہیں۔

اس کتاب میں مفید حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے جو بہت معلومات افزاء ہیں۔اردو میں آب حیات کے بعد کوئی ایسا مسلسل ومکمل، شستہ وشائستہ تذکرہ موجود نہیں تھا جو وقیع علمی مآخذ کی حیثیت رکھتا ہو چنانچہ جیسے ہی گل رعناء علمی منظر نامہ پر آئی ہاتھو ہاتھ لی گئی۔

کتابیات:

(۱) یادرفتگاں، علامہ سید سلیمان ندویؒ
(۲) حیات عبدالحی، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
(۳) علامہ سید عبدالحی الحسنی، الدکتور السید قدرۃ اللہ الحسینی
(۴) روداد چمن، مولانا سید محمد الحسنی
(۵) خانوادۂ علم اللّٰہی، مولانا سید محمد ثانی حسنی
(۶) تاریخ ندوۃ العلماء (اول)، مولانا محمد سحاق جلیس ندوی
(۷) تاریخ ندوۃ العلماء (دوم)، مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خاں
(۸) اسلامی ثقافت اور ندوۃ العلماء، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی
(۹) آزاد ہندوستان میں عربی زبان وادب، ڈاکٹر محمد ارشاد ندوی نوگاوی
(۱۰) نزھۃ الخواطر وبھجۃ المسامع والنواظر، مولانا عبدالحی فخرالدین الحسنی
(۱۱) الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند، مولانا عبدالحی فخرالدین الحسنی
(۱۲) الھند فی العھد الاسلامی، مولانا عبدالحی فخرالدین الحسنی
(۱۳) گل رعنا، حکیم سید عبدالحئ (دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی)

☆☆☆

ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ہندوستان میں فارسی کے طبی آثار

چکیدہ: طب جسمانی امراض کے فطری طریقہ علاج کا علم ہے اسے حکمت بھی کہتے ہیں۔ اس علم کی ابتداء یونان کی زرخیز سرزمین سے ہوئی اسی مناسبت سے طب یونانی کے نام سے مشہور ہے۔ بانی طب اسقلی بیوس کو قرار دیا جاتا ہے، اس کی سولہویں پشت میں بقراط پیدا ہوئے۔ اہل یونان کے مُدیک طب کے آٹھ ارکان ہیں جنہیں طب کے آٹھ ستون بھی کہا جاتا ہے۔ اسقلی بوس، غورس۔ مینس۔ برمایندس۔ افلاطن۔ اسقلی بوس دوم بقراط جالینوس۔ بقراط ہی وہ پہلا شخص نے جس نے فن طب کی ترتیب و تدوین کر کے اسے فنا ہونے سے محفوظ کیا۔

کلیدی الفاظ: مرض، طب، جسم

مرض کا تصور، صحت کی بحالی، علاج، واصول معالجہ کا طریقہ کار ان تمام کے بنیادی اصولوں کے وضع کرنے کا سہرا بھی بقراط کے سر جاتا ہے۔ بقراط ہی نے سب سے پہلے نظریہ اخلاط کی بنیاد رکھی اور یہ بتایا کہ جسم انسانی خون، صفراء، سودا، اور بلغم چار خلیوں کے تناسب سے صحت مند رہتا ہے اور ان کے اندر کمیاتی یا کیفیاتی خلل واقع ہونے سے مرض پیدا ہوتا ہے۔

بقراط ہی نے طب کی اخلاقیات مرتب کی جس کو ہپوکریٹک اوتھ کہا جاتا ہے۔

بقراط ہی نے سب سے پہلے شفاخانے یا بیمارستان قائم کئے اس کے علاوہ فن طب پر اس کی 72 تصانیف کا بھی ذکر آتا ہے۔

سقراط، بقراط، افلاطون، ارسطو اور جالینوس جیسی عظیم ہستیوں نے اس فن کی آبیاری کی، بابل، نینوا، مصر، روم، ایران، شام سے ہوتا ہوا یہ علم خطہ عرب پہنچا جہاں اس کی خوب پزیرائی ہوئی، عباسی خلفاء نے طب یونانی کو کافی فروغ دیا اور بغداد سے جڑی بوٹیوں پر باقاعدہ تحقیق کا آغاز ہوا، بڑے بڑے ہاسپٹل اور میڈیکل کالجوں کا قیام عمل میں لایا گیا بوعلی سینا، ابوبکر زکریا رازی، ابوقاسم الزھروی، جابر بن حیان علی بن ابن طبری، ابن الہشیم، ابن رشد، نجیب سمرقندی، خالد بن یذید، یعقوب بن اسحاق کندی، احمد بن محمد الطبری، ابن بطلان، ابن زہر، داؤد، انطا کی علی بن رضوان جیسے عظیم اطباء وحکماء نے اپنی ذہانت تدبر، اور تجربات کو اپنی قوت تحریر سے ضخیم کتابوں میں محفوظ کر کے اپنے اسلاف کو فکر وعمل کی دعوت دی اور اس عظیم طبی سرمایہ سے نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ اہل یورپ نے بھی خوب استفادہ کیا اور ان کتابوں کے قلمی نسخے آج بھی اہل یورپ کی توجہ کا مرکز ومحور ہیں۔

چوتھی صدی ہجری سے ہی فارسی زبان میں طبی آثار کا ثبوت ملتا ہے۔ ابومنصور موفق ہروی کی کتاب ''الابنیہ عن الحقائق الادویہ'' اور ابوبکر ربیع بن محمد الاخوینی البخاری کی ''ہدایۃ المتعلمین فی الطب'' اور حکیم میسری Maysiri کی ''دانش نامہ در علم پرشکی'' (منظوم) کو فارسی میں طب یونانی کی قدیم ترین کتب مانا جاتا ہے۔

بارہویں صدری عیسوی میں غزنویوں کے ساتھ بے شمار شعراء ادبا اہل فن وفضلا کے ساتھ حکماء واطباء بھی ہندوستان

آئے۔اس خاندان کے آخری فرمانروا خسرو ملک نے جو کہ خود بھی طب سے کافی لگاؤ رکھتا تھا نہ صرف اطباء کی سرپرستی کی بلکہ لاہور میں پہلا طب یونانی کا مرکز قائم کیا۔اس دور کے مشہور اطباء میں دیہ الدین عبد الدافع، بدرالدین دمشقی، صدرالدین طالب، علاء الدین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان میں دیگر علوم وفنون کے ساتھ فن طب پر بھی بڑے شورشدت کے ساتھ کام ہوا ہے حکماء اطباء نے طب کے موضوع پر بے شمار منظوم ومنثور تصانیف قلمبند کیں۔

طب یونانی کی ترقی کے لئے عہد تغلق کافی ممتاز ہے۔یہی وہ دور ہے جس میں ہندوستان اطباء نے طب یونانی کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لی اور اسے ہندوستانی ماحول سے ہم آہنگ کیا۔ہندوستانی طریقہ علاج آیورویدکے پاس طب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔یونانی اطباء نے اس سے بھرپور استفادہ کیا اور طب یونانی کو مزید وسعت بخشی مشہور فرمانروا محمد بن تغلق خود طب یونانی سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔اور خود بھی ایک حاذق طبیب تھا، اور اس کے دور میں طب یونانی کا فروغ لازمی امر تھا چنانچہ اس کے درباری طبیب ضیاء محمد مسعود رشید زنگی غزنوی المعروف بہ مبارکباد نے ''مجموعہ ضیائی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے آیورویدسے جابجا استفادہ کیا ہے۔

یہ کتاب 45 ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کئی حصوں میں منقسم ہے جن میں کلیات طب، تشریح نبض، بول وبراز، مختلف امراض کا طریقہ علاج کی تفصیل، امراض اطفال، معجونات، اطریفلات حبوب، ادویہ اور ان کی شناخت، قصد واستفراغ، ابدال ادویہ اورز ہروں کے تریاق سے بحث کی گئی ہے۔بحیثیت مجموعی یہ کتاب اپنے موضوع اور اپنی قدامت کے لحاظ سے نہایت جامع اور اہمیت کی حامل ہے۔محمد بن تغلق کی طرح فیروز شاہ تغلق بھی طب سے کافی دلچسپی کے ساتھ مہارت بھی رکھتا تھا جس کا ثبوت طب فیروز شاہی ہے۔

فیروز شاہ تغلق نے دہلی میں شفاخانے قائم کئے جہاں غریبوں کا مفت علاج ہوتا تھا۔اس کے عہد کی ایک طبی تصنیف ''راحت الانسان'' کا بھی پتہ چلا ہے، جسے الیاس بن شہاب نے لکھا ہے۔اس میں جڑی بوٹیوں ادویہ، تغذیہ، کے متعلق بحث کی گئی ہے۔

عہد لودھی کے نادر طبیب بہوا بن خواص جو سکندر لودھی کے درباری امیر خواص خاں کا بیٹا تھا اسے طب یونانی اور طب ھندی دونوں پر کافی دسترس حاصل تھی اس نے وہ ''معدن الشفا سکندر شاہی'' لکھی، یہ کتاب ایک مقدمہ اور تین ابواب پر مشتمل ہے مقدمہ میں طب کے مبادیات سے بحث کی گئی ہے۔

پہلی فصل کو 32 فصلوں میں منقسم کر کے اصول تشخیص وعلاج پر نہایت جامع بحث کی گئی ہے۔اس کے علاوہ مختلف دواؤں کی تیاری اور ان کے افعال کے بارے میں نہایت مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

دوسرا حصہ تشریح کے بیان پر مشتمل ہے جس میں جنین کے ارتقائی مراحل، جوارع کی تفصیل، عروق کی تعداد اور حاملہ کے بارے میں معلومات درج کی گئی ہیں۔

تیسری فصل امراض اور علامات کے مفصل بیان پر مشتمل ہے، اس فصل میں تقریباً تمام امراض نظام کے ساتھ حمیات اور امراض متفرقہ کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔بحیثیت مجموعی یہ کتاب اپنے موضوع پر بے حد جامع ہے، اس کے مطالعہ سے طب یونانی کے ساتھ آیورویدسے متعلق جملہ ضروری معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔

گجرات کے مشہور طبیب شہاب بن عبدالکریم ناگوری نے فن طب پر گرانقدر تصانیف لکھی ان کی مشہور تصانیف میں

طبشہابی،طب شفاء الخانی،فرہنگ شہابی،شفاء الامراض اور طب صدیقی شامل ہیں۔

شرف الدین اسماعیل بن حسین جرجانی نے ابوبکر بن ربیع اخوینی اور منصور ہروی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شہرہ آفاق کتاب ''ذخیرہ خوارزمشاہی''لکھی۔یہ کتاب دس جلدوں پر مشتمل ہے اس کی اولین چار جلدیں کلیات طب پر مشتمل ہے۔

''ذخیرہ خوارزمشاہی'' دواؤں،زہروں اوبیماریوں اوران کی تلخیص پر ایک نہایت جامع ومفصل کتاب ہے۔

عہد مغلیہ کوطب یونانی کا سنہرا دور کہا جاسکتا ہے۔اس عہد میں ہندوستان کے ہر گوشے میں اطباء،معالجہ،تجربات،اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ عوام میں اس فن کورائج کرنے کے لئے کوشش کی گئی،چنانچہ یوسف بن محمد بن یوسف المعروف حکیم یوسفی، جواس دور کا ایک شاعر،انشاپرداز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نامور طبیب بھی تھا انے فن طب پر کئی کتابیں لکھی ہیں،جامع الفوائد طب یوسفی،رسالہ ماکول ومشروب ریاض الادویہ،فوائدالعقاتیر،جامع الذواید،علاج الامراض دلائل البول،ستہ ضروریہ دلائل نبض وغیرہ شامل ہیں۔طب یوسفی جیسے جامع الفواید اورفواید الاخیار بھی کہتے ہیں۔حکیم یوسفی کی منظوم طبی تصنیف ہے اس کی متعدد شرحیں بھی لکھی گئی ہیں،یہ کتاب بادشاہ بابر کے نام معنون کی گئی ہے۔

اس عہد میں ''ذبدۃ الکامل''حکیم شرف الدین یزدی نے لکھی۔طب فیضی سید نوراللہ حسین کی تصنیف ہے یہ دونوں تصانیف منظوم ہیں۔

عہد ہمایوں کے نامور طبیب محمد بیگ نے دستور الفصد اور''خواص الاشیاء''لکھی ایران سے عہد مغل میں ہندستان آنے والے حکماء واطباء میں حکیم شمس الدین گیلانی،ابوالفتح گیلانی،فتحاللہ شیرازی اورحکیم ہمام کے نام قابل ذکر ہیں۔

ابوالفتح گیلانی نے''فتاحی''لکھا جومحمود بن عمر کی قانونچہ کی مبسوط شرح ہے اور چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔

حکیم فتح اللہ شیرازی نے القانون فی الطب کی فارسی میں شرح لکھی روشن ضمیر بن تابع نے مقتدی اشروح کی شرح'' موجز''لکھی۔حکیم عبداللہ دوائی لاہیجی نے جو بادشاہ شاہجہاں کے استاد تھے انہوں نے''خلاصۃ الطب''کے نام سے موجز کی فارسی میں شرح لکھی۔

نورالدین محمد عبداللہ شیرازی نے''طب داراشکوہی''لکھی جو ہندوستانی اور یونانی طب کا نچوڑ مانی جاتی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے جامع الاطباء اورقسطاس الاطباء بھی لکھی۔

حکیم علی گیلانی نے مجربات علی،شرح قانون،شرح معالجات لکھی۔یہ اکبری عہد کے اطباء میں نہایت ممتاز تھا اور معالجانہ مہارت کی بناء پر اسے''جالینوس زماں''کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔حکیم صدرا حکیم فخر الدین شیرازی کا بیٹا تھا۔حکیم فخر الدین اپنے دور کے بے حد مشہور طبیب مانے جاتے تھے۔انہیں مریضوں کے معالجہ میں بڑی دسترس حاصل تھی اس عہد کے اطباء ان کی شاگردی پر فخر کرتے تھے اپنے والد کی طرح حکیم صدرا بھی کافی مشہور تھا اوراسی بناء پرانہیں''مسیح الزماں''کے خطاب سے نوازا گیا تھا ان کی بھی تصانیف ہیں۔

حکیم محمد اکبرارزانی نے طب کے عربی ذخیرہ کو فارسی میں منتقل کرنے کا فریضہ انجام دیا ان کے اس عظیم کارنامہ کو تاریخ طب میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ان کی تصانیف میں''طب اکبر''،مفرح القلوب،قرابادین قادری،مجربات اکبر میزان الطب،حدود الامراض قابل ذکر ہیں۔

حکیم علوی خاں عہد عالمگیری کے مایہ ناز طبیب تھے۔حکیم علوی خاں کے والد مرزا ہادی شیرازی نے شرح قانونچہ لکھی

علوی خاں نے علمی وعملی دونوں شعبوں میں طب یونانی کو اوج کمال پر پہنچایا، انہوں نے طبی نظام کے ہر موضوع اور ہر شعبہ پر مبسوط کتابیں لکھیں۔ انہوں نے جامع الجوامع میں کلیات طب کے بارے میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی طبی یادگاروں میں ''قرابادین علوی'' خاں شرح اسباب وعلامات کا حاشیہ۔ ''شرح موجز القانون'' احوال اعضاء النفس، 'الکتاب النبات' خلاصہ قوانین علاج تزکرۃ العلاج، دستور العلاج، علاج الانسان، خلاصہ التجارب۔ ہندوستان کی طب کی تاریخ میں سلسلہ علوی خانی کو کافی اہمیت حاصل ہے علوی خاں کے شاگردوں میں حکیم شریف خاں کے والد حکیم اکمل خاں اور چچا حکیم اجمل خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔

حکیم امان اللہ خاں بہادر فیروز جنگ مخاطب وخاں زماں تھا۔ قرابادین خان زمانی گنج بادآوردصاحب قرانی ہے جو قرابادین کی انسائکلو پیڈیا ہے۔ اور یہ کی شناخت و ماہیت، مرکب ادویہ کی تیاری وغیرہ پر ایک شاہکار تصنیف ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ تمہیدی ہے جس میں غذا اور ادویات سے متعلق تفصیل بیان کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں امراض، مرکبات، اور عطریات کا تزکرہ کیا گیا ہے۔ آخری حصہ میں اشیاء کے خواص ومزاج اور سیارات کا بیان ہے۔ اس کتاب کے تمہیدی باب سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے طب کے مشہور تصانیف جیسے اختیارات بدیعی، مرکبات شریحی' طب جلالی، طب اسکندری، طب فارس، کتاب القانون، طب ابراہیم شاہی' رسالہ چوب چینی، ذخیرہ خوارزم شاہی، کامل الضاعتہ' کفایہ منصوری، طب فیروز شاہی، خلاصتہ التجارب، صحاح الادویہ مفتاحالحدود الحادی، شرح الاسبات العلامات جیسی اہم تصانیف سے استفادہ کیا ہے۔ حکیم امان اللہ خاں کی دیگر اہم طبی تصانیف میں ام العلاج، مفتاح الحدود مع مقدمہ مفتاح الحدود عشرہ کاملہ خاں زمانی، رسالہ درطریقہ مسہلات، مقدمہ برمرات الجواہر دستور الہند وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ابوالخیر محمد بن محمد الفارسی کی تصنیف انیس الاطباء دوصحیفوں پر مشتمل ہے، صحیفہ اول میں طب نظری سے بحث کی گئی ہے اور صحیفہ دوم میں امراض کا بیان ہے۔

مخزن الاسرار الاطباء محمد مہدی بن محمد جعفر بن محمد حسن طیب اکبر آبادی کی علم طب پر نہایت جامع تصنیف ہے۔

شرح محسنی محمد محسن خیر آبادی کی طب پر قابل قدر تصنیف ہے۔ تعلیمات بہادر شاہی حکیم عسکری کی 476 صفحات پر کلیات طب پر نہایت ضخیم تصنیف ہے۔ قرابادین کبیر حکیم میر محمد شیرازی کی تصنیف ہے۔ آپ نے علم ادویہ کی پہلی جلد کی تلخیص خلاصہ الحکمتہ لکھی۔

قطب شاہی عہد کے مشہور ترین طبیب حکیم میر مومن جو پیشواء مملکت بھی تھے۔ انہوں نے فن طب پر ''اختیارات قطب شاہی'' اور ''رسالہ مقداریہ'' کے نام سے دو کتابیں لکھی۔ ''اختیارات قطب شاہی'' علی بن الحسین معروف بہ جامی زین الدین العطار کی مایہ ناز تصنیف ''اختیارات بدیعی'' کے تنقیدی وتوضیحی مطالعہ پر مشتمل ہے اس کتاب کو میر مومن نے قطب شاہ کے نام معنون کیا۔

میر مومن کی دوسری تصنیف ''رسالہ مقداریہ'' طبی اوزان پر ایک مستند کتاب ہے، طبی اوزان کے تعین کا مسئلہ بے حد اہم ہیخاص طور سے ادویہ کی عربی کتابوں میں مزکور طبی اوزان بیک وقت اس قدر تضاد پیش کرتے ہیں، اور مختلف مقامات میں رائج طبی اوزان بھی زبردست ذہنی تضاد والجھن پیدا کرتے ہیں چنانچہ خود قلی قطب شاہ نے اس مسئلہ کے حل کے لئے میر مومن کو اس موضوع پر رسالہ لکھنے کی ہدایت کی تھی۔ یہ رسالہ مقداریہ ایک مقدمہ بارہ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے ہر باب ایک وزن کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔

میر مؤمن کے شاگرد اور مشہور طبیب تقی الدین محمد بن صدرالدین علی نے ''میزان طبایع قطب شاہی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کا موضوع بھی طبی اوزان ہے، محمد قطب شاہ طب سے بہت دلچسپی رکھتا تھا اطباء کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ اس نے خود طب پر کئی رسالے لکھے جیسے احکام المطبین، مصباح الارواح وغیرہ، خرقتہ العلماء ابن بھان کی طب پر ایک جامع تصنیف ہے جو پانچ جلدوں میں لکھی گئی ہے۔اس دور کے مشہور طبیب حکیم الملک نظام الدین احمد گیلانی سلطان عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر اس نے ''عسل مصفا'' نامی کتاب لکھی، نظام الدین احمد کی دیگر طبی تصانیف میں مجموعہ حکیم الملک، یہ 17 ابواب پر مشتمل ہے اس کتاب میں ادویہ مفردہ کیمیاء سیمیا، ہمیا' ریمیا، پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔شجرہ دانش نظام الدین نے اس کتاب میں حیوانات، نباتات، اطباء کو ہدایۃ کے علاوہ ادویہ سموم، اوران کے تریاق اور بعض امراض کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ان کی ایک اور کتاب ''قادزہر'' بھی بتائی جاتی ہے۔نظام شاہی عہد کے طبی آثار میں ذخیرہ نظام شاہی، تقویم الابدان، تقویم الامراض، رسالہ حفظ صحت وغیرہ کے نام آتے ہیں۔رستم جرجانی اس عہد کے ایک مشہور طبیب تھے ان کی تین کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔

ا۔لذت النساء، حمیات مرکبہ، اور ذخیرہ نظام شاہی۔

ذخیرہ نظام شاہی دو جلدوں پر مشتمل ہے کتاب کے دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب برہان نظام شاہ کے حکم سے لکھی گئی۔یہ کتاب 20 ابواب پر مشتمل ہے جس میں ادویہ مفردہ اور ادویہ مرکبہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔بہرحال یہ طب پر ایک جامع تصنیف ہے۔اس دور کا ایک اور مشہور طبیب حکیم ولی گیلانی تھا اس کی بھی تین کتابوں کا پتہ چلتا ہے:

ا۔تقویم الابدان

۲۔تقویم الامراض

۳۔رسالہ حفظ صحت

عادل شاہی دور مشہور اطباء میں سرفہرست محمد قاسم فرشتہ کا نام آتا ہے۔

محمد قاسم فرشتہ بچپن ہی میں استرآباد (ایران) سے ہندوستان آ گیا تھا اس نے مشہور تصنیف ''اختیارات قاسمی'' لکھی، جو ''دستورالاطباء'' کے نام سے مشہور ہے۔

کتاب دستورالاطباء یا اختیارات قاسمی ایک مقدمہ اور تین حصوں اور ایک تلخیص پر مشتمل ہے۔مقدمہ میں مصنف نے طب ہندی سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں پہلے حصہ میں حروف ابجد کی ترتیب سے 683 دواؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔کتاب کا دوسرا حصہ 15 فصلوں پر مشتمل ہے اسمیں مختلف امراض کی مفید دواؤں کا بیان ہے۔اس حصہ میں مفرحات، جوارشات' حبوب، اقراص، سفوف، منجن، روغنیات، جوشاندہ، مراہم، حقنہ، اور مشروبات پر جامع بحث کی گئی ہے تیسرا حصہ امراض اور اس کے علاج سے متعلق معلومات پر محیط ہے۔فن طب پر یہ ایک نہایت جامع تصنیف مانی جاتی ہے۔

آصف جاہی دور کے مشہور اطباء میں حکیم احمداللہ خاں حکمت وطبابت میں مشہور تھے، ان سے منسوب تصانیف میں شفاء المجدور۔اس کتاب میں مرض چیچک سے متعلق مفید اطلاعات ملتی ہیں جو آج بھی بے حد مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔ان کی دیگر تصانیف میں تحقیق البحران۔رسالہ ''تحقیق فی النبض'' قابل ذکر ہیں۔حکیم رضا علی خاں بھی اس دور کے مشہور اطباء میں شمار ہوتے ہیں، ان کے والد حکیم محمود علی بن حکیم حضرت اللہ بھی اپنے دور کے ممتاز طبیب تھے انہوں نے ''فوائد محمودیہ'' کے نام سے ہند کی جڑی بوٹیوں پر ایک رسالہ لکھا تھا۔

حکیم رضا علی خاں نے کتاب ''تزکرۃ الہند'' لکھی جو ''یادگار رضائی'' کے نام سے مشہور ہے اپنی غیر معمولی افادیت کی

بناء پر یہ کتاب کئی مرتبہ شائع ہوئی ہے۔

یہ کتاب دوجلدوں پر مشتمل ہے کتاب کو تذکرہ اول، دوم اور سوم میں تقسیم کیا گیا ہے، پھر ہر تذکرے کو فائدہ کے عنوان سے تقسیم کیا گیا ہے۔ کتاب حروف ابجد کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے جلد اول میں حرف سین تک کی دوائیں اور آگے کی دوائیں جلد دوم میں درج کی گئی ہیں۔ اس کتاب میں ادویہ کی ماہیت شناخت، اور افعال وخواص بہت تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

کتاب کے دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے آیورویدکی تمام مستند کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ساتھ ساتھ ہندی دواؤں کے متعلق یونانی اطباء کے بیانات بھی شامل کئے گئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی علم الادویہ کے موضوع پر نہایت جامع تصنیف ہے۔

حکیم سعید احمد امروہوی مشہور طبی خاندان طبیّہ عسکریہ سے تعلق رکھتے تھے آپ کی طبی مہارتوں کا شہرہ سن کر نواب سر آسمانجاہ بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ نے حیدرآباد بلایا۔ آپ نے حیدرآباد دکن میں ایک بڑے شفاخانے کی بنیاد ڈالی۔

حیدرآباد میں طب یونانی کے نشاۃ ثانیہ میں آپ کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ آپ کی تصانیف میں رسالہ تسکین الانفس بہ تحقیق ذیابیطس اس رسالہ میں ذیابطس کے علمی اور عملی نظریات پر بحث کی گئی ہے۔

رسالہ تحفۃ الافاضل

تعلیقات سعیدیہ علی المسائل الحکمت

شرح اسباب وعلامات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

رازقِ باری عہد آصفی میں موضوع طب پر بنسی راجہ گردھاری پرشاد باقی نے لکھی اس میں میوہ، پھل، پھول، ساگ سبزی، دال، گوشت، اناج اور مختلف غذاؤں کے افعال وخواص منظوم بیان کئے گئے ہیں۔

غرض ہندوستان میں فارسی زبان میں بے شمار منظوم ومنثور تصانیف ضبط تحریر میں لائی گئیں۔ جن میں سے کچھ زیور طبع سے آراستہ ہوئیں اور بہت کچھ ابھی مخطوطوں کی شکل میں یورپ کے مختلف کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر زہرہ خاتون
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

امام صادق: ارشادات وفرمودات کے حوالے سے

چکیدہ: ایسا شرف تو اللہ کے انتہائی برگزیدہ بندے کو ہی نصیب ہوگا جس کا سینہ کلام الٰہی کے نور سے منور و معمور ہو اور وہیں احادیثِ نبویؐ بھی مرتسم اور محفوظ ہوں۔ جسے روحانیت اور علم میراث میں ملے ہوں اور اکتسابی بھی ہوں، جو بقول امام ابوحنیفہؒ ''فقیہ لاثانی'' ہو، جس کے عز واحترام کا زمانہ معترف ہو، ایسی ہی شخصیت تھی، حضرت جعفر بن محمد ملقب بہ صادقؒ کی۔ جن کے مناقب و کرامات کے بارے میں جس قدر بھی لکھا جائے، اور جتنا کچھ بھی بیان کیا جائے کم ہوگا۔

کلیدی الفاظ: امام صادق، ارشادات، فرمودات

آپ کا نام جعفر، ابوعبداللہ کنیت اور ''صادق'' لقب تھا۔(۱) آپ امام محمد ملقب بہ باقر کے صاحبزادے اور فرقۂ امامیہ کے چھٹے امام ہیں، آپ کی والدہ ام فردہ حضرت ابوبکر صدیق کے پوتے قاسم بن محمد کی بیٹی تھیں۔(۲) اس طرح امام جعفر صادقؒ کا ننہالی سلسلہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جاملتا ہے۔

آپ ایک ایسے خانوادہ کے چشم و چراغ تھے جہاں ہر شخص ایک منفرد شخصیت کا حامل نظر آتا ہے۔ آپ کے والد امام باقرؒ اس پایہ کے عالم تھے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ ان کی تعظیم میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے تھے۔

ایک قول کے مطابق آپ کی پیدائش یکم رجب بروز پیر ۸۳ ہجری کو مدینہ میں ہوئی۔ لیکن مشہور ۱۷ ربیع الاول ہے۔ (۳) اور ۱۴۸ ہجری میں آپ نے اسی شہر میں وفات پائی۔ مزار مبارک جنت البقیع میں ہے۔

آپ کے گھرانے کے بارے میں کیا کہنا، اللہ تعالیٰ کے سب سے عظیم الشان گھرانے میں آپ کے دادا امام زین العابدین کے زیر سایہ آپ کی تربیت ہوئی۔ والد بزرگوار کے ساتھ بھی آپ نے زندگی کا بڑا حصہ گزارا اور اسی دوران تمام علوم و معارف سے اپنی شخصیت کو نکھارا پھر خواہ وہ علم فقہ، حدیث، علوم قرآنی ہو یا علم طب، کیمیا، فزک یا علم نبات وغیرہ۔ لیکن ان تمام علوم میں جو نمایاں اور واضح تھا، وہ تھا علم فقہ اسلامی۔ اس پر آپ نے خاص توجہ فرمائی اور اپنے قول وعمل سے عقائد وعبادات کی تشریح فرمائی۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے آپ کا شمار مشہور حفاظ حدیث میں ہوتا ہے اور خود آپ کے دل میں حدیث رسولؐ کا اس قدر احترام تھا کہ ہمیشہ بحالت وضو میں احادیث بیان فرماتے۔

علماء سے متعلق آپ کا نظریہ یہ تھا کہ وہ انبیائے کرام کے امین ہیں بشرطیکہ وہ سلاطین زمانہ کی آستان بوسی نہ کریں۔ تقویٰ پر آپ بہت زیادہ زور فرمایا کرتے، آپ کا کہنا تھا کہ انسان کی اصلیت کی پہچان اس کا تقویٰ ہے۔ ورنہ اگر آدمیت کے بات کی جائے تو سبھی انسان برابر ہیں۔ اسی طرح حسن ظن کی بھی متعدد موقعوں پر تلقین فرمائی ہے۔ مختصر یہ کہ سخاوت، تواضع، صبر، بلند اخلاق، مخفی طور پر صدقات، حاجت روائی میں سبقت لے جانا وغیرہ وغیرہ، آپ کی ذات پاک کی نمایاں صفات ہیں۔

عبادت وریاضت آپ کا شب وروز کا مشغلہ تھا۔آپ کا کوئی وقت عبادت سے خالی نہ گزرتا۔لیکن ساتھ ہی مذہب کے سلسلے میں کسی سے الجھنے کے سخت خلاف تھے۔فرماتے تھے کہ ''تم لوگ خصومت فی الدین'' سے بچنے کی کوشش کرو۔اس لیے کہ وہ تمہارے دلوں میں نفاق کا باعث ہوگا۔اوراصل راہ سے بھٹکا کرتمہارے دلوں کودوسری خرافات میں مشغول کردے گا۔

آپ فرماتے تھے کہ بغیر تین باتوں کے عمل صالح مکمل نہیں ہوتا،تم جب کوئی نیک عمل کروتو اسے کم سمجھو،اوراس کی پردہ داری کرواورایسے کاموں میں جلد بازی کروتبھی اس کی عظمت بڑھے گی اور جب تم اسے پوشیدہ رکھوگے تب ہی اس کی تکمیل ہوگی۔ اور جب تم ایسے کاموں میں عجلت کروگے تو خوشگواری محسوس کروگے۔چنانچہ آپ کی سادگی کی باتیں بھی تہذیب واخلاق اورعلم و حکمت سے بھرپورنظرآتی ہیں۔

آپ فرماتے تھے کہ خداجب تمہیں کوئی نعمت عطا کرے اورتم اس کو ہمیشہ باقی رکھنا چاہوتو زیادہ سے زیادہ شکرادا کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں کہ اگرتم شکرادا کروگے تو میں تم کوزیادہ دوں گا۔البتہ جب رزق ملنے میں تاخیر ہورہی ہوتو استغفار پڑھولیعنی اپنے رب سے مغفرت طلب کرو۔گناہ سرزد ہونے کی صورت میں بھی استغفار کثرت سے پڑھنے کی تاکید کی ہے۔ ایک اورجگہ فرماتے ہیں کہ جب تمہارے پاس کسی حکمراں وقت یا کسی سلطان کا کوئی حکم پہنچےتولاحول ولاقوۃ الا باللہ کثرت سے پڑھو، یہ کشادگی کی کنجی ہے۔جوشخص اپنی قسمت کے حصہ پرقناعت کرتا ہے وہ مستغنی رہتا ہےاور جودوسروں کے مال ومتاع پرنظررکھتا ہے، فقیری میں رہتا ہےاورخدا کی تقسیم سے کبھی راضی نہیں رہتا۔جوشخص دوسرے کی پردہ داری کرتا ہے، خدابھی اس کے گھر کے خفیہ حالات کی پردہ داری کرتا ہے۔جو بغاوت کے لیےتلوار اٹھاتا ہے وہ خودبھی اس کے وار سے نہیں بچتا۔جواپنوں کے لیے براسوچتا ہے،گڑھا کھودتا ہے، وہ خودبھی اس میں گرجاتا ہے۔انسان کو ہمیشہ سچ بولنا چاہیےخواہ وہ اس کے حق میں ہو یا خلاف۔انسان کی اصل اس کی عقل ہے،اس کا حسب اس کا دین ہے۔اس کا کرم اس کا تقویٰ ہے۔تمام انسان برابر ہیں۔سلامتی بہت نادر چیز ہے، گوشۂ تنہائی گوشہ گمنانی سے مختلف ہے۔یعنی عبادت وریاضت کے لیے گوشۂ تنہائی تواختیار کرولیکن خودکوگمنامی کے اندھیروں میں غرق نہ ہونے دو۔

آپ سے متعلق تذکرہ الاولیاء کے مصنف شیخ فریدالدین عطار لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ امام ابوحنیفہؒ سے آپ نے سوال کیا کہ دانشمند کی کیاتعریف ہے؟ امام صاحب نے جواب دیا کہ جو بھلےاور برے میں تمیز کرسکے۔آپ نے کہا کہ یہ امتیاز تو جانور بھی کرلیتا ہے۔کیونکہ جواس کی خدمت اوردیکھ بھال کرتا ہے وہ اسے تکلیف نہیں پہنچاتا البتہ جواسے پریشان کرتا ہے، وہ اس پرحملہ آور ہوتا ہے۔امام ابوحنیفہؒ نے پوچھا کہ پھرآپ کی نظر میں دانشمندی کی کیا تعریف ہےتواس پرآپ نے جواب دیا کہ جودو بھلائیوں میں سے بہتر بھلائی کواختیار کرےاوراسی طرح دو برائیوں میں سے نسبتاً کم برائی پرعمل کرے۔''(۴)

ایک اورواقعہ آپ سے متعلق پیش کرنا چاہوں گی، وہ یہ کہ کسی شخص کی پیسوں کی تھیلی گم ہوگئی تھی تواس نے آپ پر چوری کی تہمت لگائی۔حضرت نے اس سے سوال کیا کہ اس میں کتنی رقم تھی؟ اس نے ایک ہزار دینار بتائے، چنانچہ آپ گھر گئے اورو ہاں سے ہزار دینار لاکراس کودے دیئے۔اتفاق سے بعد میں اس شخص کی کھوئی ہوئی تھیلی اسے مل گئی تواس نے آپ سے معافی مانگتے ہوئے رقم واپس کرنی چاہی۔لیکن آپ نے یہ کہہ کرانکار کردیا کہ ہم کسی کودے کرواپس نہیں لیا کرتے۔بعد میں اس شخص کو جب آپ کااسم گرامی معلوم ہواتو وہ بےحد شرمندہ ہوا۔

خلیفہ منصور کے دربار کا ایک واقعہ پیش خدمت ہے۔ایک مرتبہ منصور نے اپنے دربان کو ہدایت کی تھی کہ امام موصوف کو

میرے پاس پہنچنے سے پہلے ہی قتل کر دینا۔اسی روز امام جعفر خلیفہ منصور کے دربار میں آ کر بیٹھ گئے۔جب آپ چلے گئے تو خلیفہ نے اپنے دربان کو بلا کر پوچھا کہ میں نے تجھے کیا حکم دیا تھا۔دربان نے کہا کہ اے خلیفہ خدا کی قسم میں نے امام صاحب کو آتے دیکھا ہی نہیں۔بس دیکھا تو یہ دیکھا کہ وہ آپ کے پاس تشریف فرما ہیں۔

ایک اور واقعہ پیش ہے کہ ایک مرتبہ امام صاحب مکہ تشریف لے جا رہے تھے،ایک عورت کو دیکھا جو راستے میں بیٹھی اپنی مردہ گائے پر آنسو بہا رہی تھی۔حضرت امام نے فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اس مردہ گائے کو زندہ کر دیں گے۔ عورت بولی کہ آپ ہم سے ایسا مذاق کیوں کر رہے ہیں،ہم پہلے سے ہی مصیبت زدہ ہیں۔آپ نے فرمایا کہ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔اور اس کے بعد آپ نے اس گائے کے لیے دعا فرمائی۔گائے کو تھوڑا ہلایا ڈولایا اور کچھ ہی لمحوں بعد گائے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

ایک آخری واقعہ،ایک مرتبہ آپ نے ایک شخص کے لیے دعا کی کہ اے اللہ اسے کثرت سے مال عطا کر،تا کہ یہ زندگی میں پچاس مرتبہ حج کرے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور اس شخص کو اس قدر مال و متاع سے نوازا کہ اس نے اپنی زندگی میں پچاس حج کیے۔

یہ اور اسی قسم کے نہ جانے کتنے واقعات،جو آپ کی ذات بابرکات سے منسوب ہیں۔لیکن اس مختصر سے وقت میں ان سب کا احاطہ کرنا ایک دشوار گزار امر ہوگا۔

حواشی و حوالہ جات:

(۱) تابعین:شاہ معین الدین احمد ندوی،ص ۶۸
(۲) ایضاً،ص ۶۹
(۳) ایضاً
(۴) تذکرۃ الاولیا:شیخ فرید الدین عطار،ص ۷

منابع و مآخذ

(۱) تذکرۃ الاولیاء:شیخ فرید الدین عطار
(۲) کشف المحجوب:شیخ علی ہجویری
(۳) تابعین:شاہ معین الدین احمد ندوی
(۴) جعفر صادقؒ (کرامات اور واقعات)
(۵) خوشبوئے حیات
(۶) تذکرۃ الحفاظ
(۷) امام جعفر صادق (سپر مین اِن اسلام)

ڈاکٹر مبشرہ صدف
پی ایچ ڈی، شعبہ اردو
بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

حنیف نقوی کی تذکراتی تحقیق: شعرائے اردو کے تذکرے

چکیدہ: میدان تحقیق و تنقید کے تیز گام پختہ کام شہسوار پروفیسر حنیف نقوی کی شخصیت سے استاد و طلباء یکساں طور پر واقفیت رکھتے ہیں۔ اردو شعراء کی تحقیق، ان کے دواوین و شعر پر تنقید تذکروں کی تحقیق ایسے کارہائے نمایاں ہیں جنھوں ان کے بقاء دوام بخشی۔ ان شعراء کی تحقیق کے لئے پروفیسر موصوف نے فارسی میں لکھے گئے تذکروں، اردو میں لکھے گئے تذکروں اور متفرق مقالوں تک کی مدد حاصل کی ہے۔ مقالہ ہذا ان کی شعرائے اردو کے تذکرے پر جس کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تنقید ہے یا تحقیق۔ شاید یہی پروفیسر موصوف کا کمال ہے۔

کلیدی الفاظ: پروفیسر حنیف نقوی، اردو شعراء، تذکرے

پروفیسر حنیف نقوی کا شمار اردو کے نامور محققین میں ہوتا ہے۔ حنیف نقوی کا یہ اختصاص بھی توجہ طلب ہے کہ انھوں نے اپنے اولین تحقیقی مقالہ ''شعرائے اردو کے تذکرے'' کے ذریعہ اردو تحقیق میں جو جست لگائی اس کے بنا پر وہ اردو کے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ حنیف نقوی بنیادی طور پر محقق کے اور ایک محقق کے جملہ اوصاف مثلاً حق گوئی، بے باکی، عرق ریزی اور مطالعہ کتب ان کی سرشت کا حصہ تھے۔

پروفیسر حنیف نقوی کا پورا نام سید حنیف احمد نقوی ہے۔ ان کے والد کا نام حکیم سید عقیل احمد ہے۔ حنیف نقوی کی پیدائش اکتوبر ۱۹۳۶ء سہسوان ضلع بدایوں (یوپی) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بدایوں (یوپی) میں مکمل کی۔ ۱۹۵۵ء میں پنّا لال میونسپل ہائی اسکول سے مٹرک کا امتحان فرسٹ ڈیویژن میں پاس کیا۔ ۱۹۵۹ء میں بی۔اے۔ کا امتحان گورمنٹ حمیدیہ کالج سے فرسٹ ڈیویژن میں کیا۔ ۱۹۶۱ء میں اردو میں ایم۔اے۔ امتیازی نمبر سے پاس کیا۔ ۱۹۶۸ء میں وکرم یونیورسٹی اُجین سے پی ایچ۔ڈی کی سند پروفیسر ابو محمد سحر کے زیر نگرانی حاصل کی۔ پی ایچ۔ڈی کا موضوع ''اردو شعرا کے تذکروں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ'' تھا۔ سیفیہ انٹر کالج بھوپال میں نومبر ۱۹۶۱ء سے مئی ۱۹۶۲ء تک بہ حیثیت اسسٹنٹ ٹیچر مقرر رہے۔ دسمبر ۱۹۶۳ء تک فضل الرحمٰن اسلامیہ انٹر کالج بریلی میں لکچرر رہے۔ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۹۶۹ء تک ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۷۰ء میں شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی میں بہ حیثیت لکچرر مقرر ہوئے۔ اسی شعبے میں ۱۹۸۲ء میں ریڈر اور ۱۹۹۰ء میں پروفیسر ہوئے اور دسمبر ۲۰۰۰ء میں ملازمت کے فرض سے سبکدوش ہوئے۔ اس طرح پروفیسر حنیف نقوی ۳۰ برس تک شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ انھیں اپنے علمی اور ادبی کارناموں کے سبب بہت سے اعزازات سے نوازا گیا۔ ان کی زیادہ تر کتابوں کو اعزازات اور انعامات عطا کیے گئے۔ اس کے علاوہ انھیں ۱۹۸۲ء میں ''امتیاز میر''، ۱۹۹۲ء میں ''افتخار میر''، ۱۹۹۸ء میں ''کوثر چاندپوری ایوارڈ سے ۲۰۰۲ء میں ''غالب ایوارڈ''، ۲۰۰۵ء میں ''میر و مصحفی ایوارڈ''، ۲۰۰۶ء میں ''مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ پروفیسر

حنیف نقوی مختلف علمی، ادبی اداروں کے رکن اور دانش گاہوں سے وابستہ رہے ہیں۔انھوں نے بہت سی تحقیقی اور تنقیدی کتابیں تصنیف کی۔اردو تحقیق میں وہ اپنے ہم عصر محققین میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ان کی تصانیف درج ذیل ہیں:

(۱) شعرائے اردو کے تذکرے (نکات الشعرا سے گلشن بے خار تک)
(۲) انتخاب کربل کتھا مع مقدمہ وفرہنگ
(۳) تلاش وتعارف
(۴) انتخاب کلام رجب علی بیگ سرورؔ
(۵) غالب: احوال وآثار
(۶) رجب علی بیگ سرورؔ۔چند تحقیقی مباحث
(۷) ماثر غالب (غالب کی کم یاب نظم ونثر کا مجموعہ)
(۸) مرزا غالب کے پنج آہنگ کا قدیم ترین خطّی نسخہ
(۹) دیوان ناسخ
(۱۰) میر و مصحفی
(۱۱) رائے بنی نرائن دہلوی (سوانح اور ادبی خدمات)
(۱۲) غالب کی چند فارسی تصانیف
(۱۳) غالب کی فارسی مکتوب نگاری
(۱۴) تحقیق وتدوین۔مسائل ومباحث
(۱۵) تذکرۂ شعرائے سہسوان
(۱۶) حیات العلما

حنیف نقوی کی تصنیفات کے ذریعہ یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ان کا علمی وادبی معیار کیا ہے۔انھوں نے جہاں ایک طرف تحقیق کے مبادیات اور اس قدر کے تعین سے دلچسپی لی وہیں عملی یا اطلاقی تحقیق لکھ کر اردو میں ایک مثال قائم کی۔ان کے تحقیق کا دائرہ وسیع ہے ایک طرف غالبؔ، میرؔ، مصحفیؔ پر غور کیا تو دوسری طرف تحقیق وتنقید اور فارسی کے تعلق بہت سی باتیں اردو ادب میں پیش کیں۔تحقیق وتدوین کے مسائل پر بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا اور ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش بھی کی۔تحقیق کے تعلق سے وہ اپنی کتاب 'تحقیق وتدوین۔مسائل ومباحث میں لکھتے ہیں کہ:

''عبارت میں ہر جملے کا اور ہر جملے میں ہر لفظ کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے، چنانچہ کسی جملے کا اپنی جگہ سے ہٹ جانے یا کسی لفظ کے اپنی نشست بدل لینے سے اس عبارت کے مفہوم میں جو تبدیلی واقع ہوتی ہے وہ بعض صورتوں میں منشائے مصنف سے مطابقت کی شرط کو پامال کرتی ہوئی اس سے انحراف یا اختلاف کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔''

(تحقیق وتدوین: مسائل ومباحث۔سید حنیف نقوی، ص۔۶۵)

حنیف نقوی کا شمار ان مشہور محققوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو تحقیق کو عزت بخشی۔تحقیق ایسا فن ہے جس میں لطف و دلچسپی کے بجائے سادگی اور صحت ودلائل سے کام لیا جاتا ہے۔حنیف نقوی سنجیدہ اور غیر معمولی علمی نظر رکھتے تھے جس کے سبب ان کے تحقیقی کاموں میں ناقدانہ صلاحیت واضح ہوتی ہے۔انھوں نے اپنے بلیغ نظر، بلند فکر اور طویل تجربے کے بعد جو تصانیف پیش

کیں وہ اعلیٰ تحقیق کی مثال ہے۔ان کے تحقیقی کاموں میں تلاش وتعارف، غالب احوال وآثار، ماثر غالب، میر و مصحفی، پنج آہنگ اورشعرائے اردو کے تذکرے کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔تحقیق کے طریقے اور تدوین کے اصول ومسائل کے متعلق سے انھوں نے تحقیق وتدوین۔مسائل ومباحث تحریر کی۔اس کتاب میں انھوں نے تحقیق وتدوین کے مسائل کو پیش کیا اور تحقیق اور تدوین کے بنیادی اصول کو واضح کیا۔ان میں تحقیق کے مسائل کے حل کو بھی پیش کیا گیا ہے۔تحقیق کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''تحقیق بازیافت کا عمل ہے۔حقائق کی یہ بازیابی ان واقعات کی تلاش وجستجو سے عبارت ہے جو سرور ایام کے ساتھ ماضی کا حصہ بنتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ ہمارے دائرہ علم سے باہر ہو جاتے ہیں۔بہ الفاظ دیگر محقق وقت کے دومتناہی سلسلے کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو دوبارہ جوڑنے اور تاریخ کی بھولی بسری سچائیوں کو از سر نو منظم ومربوط کرنے کا وہ اہم فریضہ انجام دیتا ہے جس کے بغیر نہ ہم اپنے تہذیبی تشخیص کا عرفان حاصل کر سکتے ہیں اور نہ علوم وفنون کا کارواں نئی جہتوں سے آشنا اور نئے آفاق سے روشناس ہوسکتا ہے۔''

(تحقیق وتدوین: مسائل ومباحث۔سید حنیف نقوی،ص۔۱۱)

''شعرائے اردو کے تذکرے'' تذکرہ نگاری کی تاریخ کے تعلق سے پہلی مستند تحقیقی تصنیف تسلیم کی جاتی ہے۔اس اعتبار سے اسے تذکرہ نگاری کی تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں۔یہ کتاب پروفیسر حنیف نقوی کے کاوشوں اور مسلسل محنت کا نتیجہ ہے۔''شعرائے اردو کے تذکرے'' دراصل ان کا پی ایچ۔ڈی کا موضوع ہے۔ان کا یہ تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ جب ۱۹۶۲ء میں کتابی شکل میں منظر عام ہوا تو اردو دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور تحقیق کی اعلیٰ مثال بن گیا۔اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے شائع ہوا۔دوسرے ایڈیشن میں حنیف نقوی نے ترمیم اور اضافے بھی کیے۔یہ کتاب تذکرہ نگاری کی روایت کو پہلو بہ پہلو اور اردو تذکرہ نگاری کی تاریخ کو عہد وار پیش کرتی ہے۔اس کتاب کو درج ذیل ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) تذکرہ نگاری بحیثیت فن
(۲) عربی وفارسی میں تذکرہ نگاری کی روایت
(۳) اردو تذکرہ نگاری (آغاز سے شیفتہ کے عہد تک)
(۴) نکات الشعرا اور دوسرے ابتدائی تذکرے
(۵) چمنستان شعراء سے گلشنِ سخن تک
(۶) تذکرہ ہندی، ریاض الفصحا اور معاصر تذکرے
(۷) طویل اور جامع تذکرے

پہلے باب میں تذکرہ کے لغوی معنی سے لے کر مفہوم اور اصطلاح کی تشریح کی گئی ہے۔پروفیسر حنیف نقوی نے تذکرہ نگاری کے محرکات اور تقاضے کو بخوبی واضح کیا ہے۔تذکروں کی تقسیم اور ترتیب میں ان کا تحقیقی اور تنقیدی انداز نمایاں ہوتا ہے۔انھوں نے تذکرہ نگاری کے فنی حدود کا تعین کیا اور یہ واضح کیا کہ کن بنیادی تقاضوں کے سبب تذکرہ، بیاض اور تاریخ سے مختلف ہوتا ہے۔تذکرہ اور بیاض کے متعلق انھوں نے واضح کیا کہ تذکرہ نگاری اور بیاض دو مختلف ہیں۔انھوں نے بیاض کے متعلق سے چند اہم باتیں پیش کی۔انھوں نے واضح کیا کہ بیاض نویس اپنے دلچسپی اور رزق کے مطابق اشعار کا انتخاب کرتا ہے اور کوئی بات تحریر کرتا ہے۔اس لیے بیاض میں کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہوتی۔جب کہ تذکرہ نگار تذکرے میں شاعروں کا مختصر مگر مکمل تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہے۔یہی وہ بنیادی فرق ہے جو تذکرہ نگار کو بیاض سے الگ کرتا ہے۔تذکرہ نگاری اور تاریخ کے فرق کے بارے میں

وہ لکھتے ہیں کہ تذکرہ نگار کو علمی و ادبی ذوق، زبان و بیان پر قدرت، ادبی تحریکات سے واقفیت اور نظم وضبط کی پابندی کرنی چاہیے۔ جب کہ مورخ کو حالات سے واقفیت، غیر جانب داری، وسعت نظری سے کام لینا چاہیے۔ انھوں نے تذکرہ نگاری کے اصول اور طریقہ کار کو بھی پیش کیا۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:۔

''تذکرہ نگار کو بیاض نویس کی مختصر بیانی اور مورخ کی مفصل نگاری کے درمیان اعتدال وتوازن کی راہ اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اس مرحلہ میں وہ دقتِ نظر اور قوتِ فیصلہ کی پے بہ پے آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے۔ ایک طرف تو اس کے لیے ہر شاعر کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ ناگزیر ہوتا ہے جن کی رنگ آمیزی کے بغیر اس کی شخصیت کی تصویر کشی ممکن نہ ہو اور دوسری طرف ان تمام واقعات کا نظر انداز کر دینا ضروری ہو جاتا ہے جنھوں نے اس کی شخصیت کی تہذیب اور فن کی تعمیر میں کوئی اہم کردار نہ ادا کیا ہو۔ اخذ وترک کے اس مرحلے سے عہدہ برآ ہونے اور تفصیل واختصار کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ رکھنے کا یہ کام تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا ایک تذکرہ نگار کے لیے چند خاص اوصاف سے متصف ہونا اور اپنی بعض اہم ذمہ داریوں کو پوری طرح مدنظر رکھنا لازمی ہے ورنہ وہ اپنے موضوع کے ساتھ انصاف نہ کر سکے گا۔''

(شعرائے اردو کے تذکرے۔ سید حنیف نقوی، ص۔۲۷)

دوسرے باب میں عربی اور فارسی تذکرہ نگاری کی تاریخ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس باب میں انھوں نے عربی اور فارسی میں تذکرہ نگاری کی روایت کا جائزہ تحقیقی اور تنقیدی نقطہ نظر سے لیا ہے۔ عربی تذکرہ نگاری کی تاریخ میں انھوں نے دور جاہلیت سے لے کر آغاز اسلام تک کے دور کے ادبی محاسن کو پیش کیا۔ انھوں نے یہ واضح کیا کہ آغاز اسلام سے قبل عرب میں شعری کارناموں کو محفوظ کرنے کی روایت نہیں تھی اور اس کا سبب ان کا حافظہ تھا۔ عرب کے لوگوں کو اپنے حافظے پر مکمل طور پر اعتماد تھا اور ان لوگوں نے اپنے ادبی سرمایے کو تحریر کرنے کے بجائے اپنے حافظے پر اعتماد کیا۔ دراصل اس زمانے میں عربی لوگ ادبی سرمایے کو تحریر کرنا باعث توہین سمجھتے تھے۔ اس لیے دور جاہلیت میں عربی ادب اور شعری سرمایے تحریری صورت میں نہیں ملتے۔ اسلام کے آغاز کے بعد ان کے نظریے میں تبدیلی رونما ہوئی۔ یہاں تک عباسیہ دور میں عربی ادب کے متعلق بے شمار کتابیں تخلیق ہوئیں۔ اور اپنے ماضی کے یادگار اور اسلاف کے کارناموں کو بھی یکجا کر کے تحریر کیا گیا۔ اسلاف کے ادبی اور شعری سرمایے کی ترتیب وتدوین کی ابتدا ہوئی۔ اس ترتیب وتدوین میں شعرا کے زندگی کے حالات اور ان کے شعری وصائف کا بھی بیان کیا گیا۔ اس سے عربی میں تذکرہ نگاری کی روایت کی ابتدا ہوئی۔ عربی میں پہلا تذکرہ عباسیہ دور میں عبداللہ بن سلام الجمحی نے لکھا۔ فارسی میں تذکرہ نگاری کی روایت سدیدالدین محمد بن عوفی نے شروع کی اس نے ''لباب الالباب'' نام سے فارسی تذکرہ تحریر کیا۔ حنیف نقوی نے اس تذکرہ نگار سے متعلق بہت سی باتیں پیش کی ہیں اور اس کے ورودِ ہند سے لے کر تذکرہ کی تالیف کے اسباب تک بیان کئے ہیں۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

''جہاں برصغیر ہندو پاک کو یہ فخر حاصل ہے کہ فارسی زبان کے شاعروں کا پہلا تذکرہ اس سرزمین میں مرتب ہوا، وہیں یہ امتیاز بھی اس کے حصے میں آیا کہ تذکرہ نویسی کی ترقی میں یہاں کے اہلِ قلم کی کوششیں ہر دور میں ایرانی ادیبوں کی کاوشوں سے بالاتر رہی ہیں۔ ایران کے منصف مزاج اور وسیع النظر دانشوروں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ لغت نویسی کی طرح اس فن میں بھی ان کی زبان اور اہلِ وطن ہندوستانیوں کے احسانات سے گراں بار ہیں''۔

(شعرائے اردو کے تذکرے۔ سید حنیف نقوی، ص۶۴)

تیسرے باب میں انھوں نے اردو تذکرہ نگاری کی تاریخ پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اردو میں تذکرہ نگاری

کی ابتدا سے لے کر شیفتہ کے عہد تک کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور ان محرکات کو بھی پیش کیا جس کے سبب تذکرہ نگاری کی ابتدا ہوئی۔ نیز اس دور کے سماجی، سیاسی، ثقافتی پس منظر کو بھی واضح کیا ہے۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقا سے لے کر دکن اور شمال میں اردو کے فروغ کے تعلق کو بھی بیان کیا اور اس دور کے مختلف اصناف پر بھی نظر ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ حنیف نقوی نے تذکرہ نگاری کے مختلف مراکز کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ان تذکروں کے ضمن میں میر تقی میرؔ کے ''نکات الشعرا''، سید فتح علی گردیزی کے ''تذکرہ ریختہ گویاں''، حمید اورنگ آبادی کے ''گلشن گفتار''، قائم چاند پوری کے ''مخزن نکات''، عنایت اللہ فتوت کا ''ریاض حسنیٰ''، لالہ خوب چند ذکا کا ''عہد زریں''، میر محمد خاں سرورؔ کا ''عمدہ منتخبہ''، حکیم قدرت اللہ قاسم کا ''مجموعہ نغز''، مصحفیؔ کے تذکرے ''عقد ثریا''، ''تذکرہ ہند'' اور ''ریاض الفصحا'' وغیرہ بہ طور خاص ہیں جن کا مطالعہ اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کی خوبیاں اور خامیاں پوری طرح مترشح ہو جاتی ہے۔ انھوں نے تحقیقی شواہد کے بنا پر واضح کرنے کی سعی کی کہ اردو میں تذکرہ نگاری کی ابتدا کب ہوئی۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

'' شعرائے اردو کے جس قدر تذکرے اب تک دستیاب ہو چکے ہیں، ان میں بہ اعتبار قدامت میر تقی میرؔ کے ''نکات الشعرا''، سید فتح علی گردیزی کے ''تذکرۂ ریختہ گویاں''، حمید اورنگ آبادی کے ''گلشن گفتار''، قائم چاند پوری کے ''مخزن نکات''، اور عنایت اللہ فتوتؔ کے ''ریاض حسنیٰ'' کو سرفہرست رکھا جاتا ہے ''تزکرۂ ریختہ گویاں کے علاوہ ان تمام تذکروں کے مولفین نے کسی نہ کسی صورت میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو میں اس فن کے موسس ہیں اور ان کا تذکرہ ریختہ گویوں کا پہلا تذکرہ ہے۔ چنانچہ میرؔ صاحب لکھتے ہیں کہ:

''درفن ریختہ کی شعریست بطور شعر فارسی بزبان اردو معلیٰ روزگار بہ ماند، بناء علیہ ایں تذکرہ کہ مسمیٰ بہ نکات الشعرا است نکاشتہ می شود''

قائم چاند پوری نے یہی بات ان الفاظ میں کہی ہے:

''برضمیر مہر تنویر سخن طرازانِ ہندوستان............ مخفی ومحجب ماند کہ الآن در ذکر بیان اشعار واحوالِ شعرائے ریختہ کتابے تصنیف نہ گردیدہ وتا ایں زماں ہیچ انسانے از ماجرائے شوق افزائے سخنورانِ ایں فن سطر بہ تالیف نرسانیدہ۔ بنابرایں فقیر مولف............ بعد کوشش تمام وسعی مالا کلام دواویں ایں اعزہ فراہم آوردہ پارۂ ابیات از ہر کدام برسبیلِ یادگار در ذیل ایں بیاض کہ بہ ''مخزنِ نکات'' موسوم است، بہ قیدِ قلم درآوردہ''

حمید نے واضح طور پر اولیت کا دعویٰ نہ کرتے ہوئے اپنے تذکرے کو ''مضامین تازہ'' کی پیش کش سے تعبیر کیا ہے ان کا بیان ہے:

''خواستم کہ شغل پیش گیرم وتذکرۃ الشعرا نویسم لیکن چوں عبارت آرایانِ معنی طراز اکثر تذکرۃ الشعرائے فارسیہ بحیطۂ تحریر آوردہ اند، تالیف آں تحصیلِ حاصل می انجامد۔ بناء برایں تذکرۃ الشعرائے ہندیہ بہ ترتیب دادم وبہ مضامیں تازہ دلہا را گلش گلشن شاختم ونامش ''گلشنِ گفتارِ نہادم''۔

فتوتؔ کو ان کے اپنے قول کے مطابق خان آرزوؔ کے تذکرے ''مجمع النفائس'' کے مطالعے سے یہ تحریک ملی ہے کہ:

''ایجادِ تذکرۂ ہندی خالی از ندرتِ نیست''

''۱۱۷۳ھ/۶۰-۱۷۵۹ء میں سپرد قلم کے لیے ہیں، اس لیے بیک وقت ان سب کا درست ہونا ضروری طور پر ممکن نہیں۔ اس کے باوجود شدہ حقائق وواقعات کی روشنی میں فتوتؔ کے علاوہ باقی تذکرہ نگاروں کی صداقت اور نیک نیتی پر شبہ کی گنجائش

نظر نہیں آتی۔ میر صاحب نے اپنے تذکرے کے زمانۂ تالیف کی صراحت نہیں کی ہے لیکن ان کے یہاں ایسی شہادت بکثرت موجود ہیں، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۱۱۶۵ھ کے ربیع ثالث (۱۷۵۲ء) میں اس کی ترکیب سے فراغت پا چکے تھے۔ ''گلشن گفتار'' بھی مولف کے قطعۂ تاریخ کے بموجب اسی سال کی تالیف ہے۔''

(شعرائے اردو کے تذکرے۔ سید حنیف نقوی، ص۔۱۱۳۔۱۱۵)

چوتھے باب میں حنیف نقوی نے میر تقی میرؔ کے نکات الشعرا اور دوسرے ابتدائی تذکروں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے نکات الشعرا، گلشن گفتار، تذکرہ ریختہ گویاں، ریاض حسنی اور مخزن نکات کا جائزہ لیا ہے۔ میر تقی میرؔ کے تذکرے ''نکات الشعرا'' کے اس اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ اس کے سنہ تالیف کو لے کر ہے۔ تحقیقی شواہد کے بنا پر نکات الشعرا کا سنہ تالیف ۱۷۵۲ء قرار دیا گیا۔ اس تذکرے میں اس وقت کے شعرا کی شاعرانہ خوبیوں اور خامیوں کا اشارہ ملتا ہے۔ یہ تذکرہ میر تقی میرؔ کے ناقدانہ صلاحیت کا مظہر ہے۔ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی کے تذکرے ''گلشن گفتار'' کے بارے میں حنیف نقوی کا کہنا ہے کہ یہ تذکرہ مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ دکن کا پہلا تذکرہ ہے۔ تذکرۂ ریختہ گویاں جو کہ سید فتح علی حسینی گردیزی کی تالیف ہے اور شمالی ہند کا پہلا تذکرہ ہے جو کہ حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ خواجہ عنایت اللہ فتوت کے تذکرے ''ریاض حسنی'' کی سنہ تالیف ۱۷۰۹ء ہے۔ اس تذکرے میں املا کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ قائم چاند پوری کا تذکرہ ''مخزن نکات'' ہے جس میں مختلف شعرائے اردو کے حالات زندگی اور شعری خصوصیات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس تذکرے کی سنہ تالیف حنیف نقوی نے ۱۷۶۳ء قرار دی ہے۔ یہ تذکرہ تین حصوں میں تقسیم ہے۔ جس میں مختلف ادوار کی ادبی اور لسانی تاریخ کو پیش کیا گیا ہے۔ حنیف نقوی کے مطابق یہ تذکرہ علمی، ادبی، فنی اور تنقیدی بصیرت کا بہترین نمونہ ہے۔ اس تذکرے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں شعرا کے حالات اور ادبی کارناموں کو تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کے اسلوب بیان میں سادگی، متانت اور اختصار ہے۔ اس تذکرہ کے متعلق حنیف نقوی لکھتے ہیں:۔

''بالخصوص شعرا کو ادوار یا طبقات میں تقسیم کر کے انھوں نے تاریخی ترتیب کے التزام کی جو روایت قائم کی ہے، اسے اردو میں ابدی تاریخ نگاری کے اس طویل سلسلے کا سنگ بنیاد کہنا چاہئے جس کا پہلا کامیاب باب ''آب حیات'' کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ ''مخزن نکات'' کی دوسری نمایاں اور قابل ذکر خصوصیت اختصار الفاظ و وسعت معنی کا امتزاج اور طرز بیان کی متانت اور سادگی ہے۔ مولف نے اساتذہ کے علاوہ اکثر شعرا کے تعارف میں اختصار سے کام لیا ہے۔ لیکن بیشتر مقامات پر مطالب کی جامعیت اس ظاہری نقص کا ازالہ کر دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روش تشبیہات و استعارات سے گراں بار اس طویل مگر لا حاصل عبارت آرائی کے خلاف ردعمل کا نتیجہ ہے جسے اس زمانے کے اہل قلم اپنا طرہ امتیاز سمجھے ہوئے تھے۔''

(شعرائے اردو کے تذکرے۔ سید حنیف نقوی، ص۔۲۵۹)

پانچویں باب چمنستان شعرا سے گلشن سخن تک کے تذکروں کو تحقیقی نقطے سے دیکھا گیا۔ حنیف نقوی نے اپنے محققانہ نظر اور ناقدانہ صلاحیت کے ذریعہ چمنستان شعرا، طبقات الشعرا، تذکرہ شعرائے اردو، تذکرہ شورش مسرت افزا، گل عجائب، گلزار ابراہیم اور گلشن سخن کا معیار متعین کیا۔ دکن کے تذکروں میں ''چمنستان شعرا'' کو اہم مقام حاصل ہے۔ یہ تذکرہ لچھمی نرائن شفیق کی تالیف ہے۔ اس تذکرے میں ادبی معیار اور ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ تذکرہ دکنی شعرا کے ساتھ شمالی ہند کے شعرا کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ اس تذکرے کی خامی اس کا اسلوب ہے جو بے جا پر تکلف ہے۔ کہیں کہیں اس قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے بعض باتیں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ اس تذکرے کی خوبیوں اور خامیوں کے متعلق حنیف نقوی لکھتے ہیں:۔

''دکنی تذکروں میں حسن ترتیب، جامعیت اورادبی معیار کے لحاظ سے''چمنستان شعرا'' کا نام سرفہرست ہے۔اس کے مولف لچھمی نرائن شفیق بڑے باصلاحیت اور ذی علم انسان تھے۔اورنگ آباد جیسے گہوارۂ علم وادب سے وطنی وابستگی اور علامہ آزاد بلگرامی کے فیضان تربیت کی بدولت ان کی شخصیت کے جوہر نکھرے اور کم عمر ہی میں شعر وادب نیز تصنیف وتالیف سے ان کی طبعی دلچسپیاں بامِ عروج تک پہنچ گئیں۔یہ تذکرہ جو انھوں نے صرف سترہ (۱۷) سال کی عمر میں ترتیب دیا تھا اور جسے بابائے اردو مولوی عبدالحق ۱۹۲۸ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے شائع کر چکے ہیں، ان کی غیر معمولی علمی شغف اور شائستہ ادبی ذوق کا ایک بیّن ثبوت ہے۔اگرچہ بقول شفیق ان سے پہلے دکن کے کئی اہلِ قلم اس میدان میں اپنے علم وبصیرت کی داد دے چکے تھے لیکن اس کا دائرہ کار بیشتر دکنی شاعروں کے تعارف تک محدود تھا۔یہ ایک بہت بڑی کمی تھی جسے انھوں نے محسوس کیا اور جب میر گردیزی کے تذکروں کی وساطت سے شمالی ہند کے ریختہ گویوں کے حالات اور کلام تک ان کی رسائی ہوئی تو وہ اس کے ازالے کی غرض سے ''چمنستانِ شعراء'' کی تسوید وترتیب کی طرف راغب ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے میں ان کی یہ گراں مایاں تالیف تکمیل کے مراحل طے کر کے منظر عام پر آ گئی۔دیباچے کے ذیل میں ان حالات ومحرکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ ''دریں اثنا تذکرۂ''نکات الشعراء'' من تصنیفِ میر تقی میر وتذکرۂ فتح علی خاں تازہ از ہندوستان نزول نمودہ شورے در عالما انداخت و جہانے را دراشتیاقِ اشعارِ ہند کہ بہم رسیدنِ آں اہل دکن را خیلے دشوار است، تہ وبالا ساخت۔لہذا بہ خاطر فاتر وفکرِ ناقص گذشت کہ خود ہم ایں ہمہ اشعارِ ہر دو تذکرہ گرفتہ ودیگر لآلی را یک جامع ساختہ بطورِ سفینہ کہ انیسِ یکتائی وہمدمِ تنہائی شود، نقش باید بست زیرا کہ بدین تقریبِ غریب وتمہید عجیب شاہد احوال بعضے محبانِ سخن داں برکرسئ تبیین می تو نشست ....(پس) کمر را چُست بستم وسمندرِ صبا تگِ قلم بسرعتِ سریعہ درمیدانِ تحریر ایں نسخہ برانگیختم''۔تذکرے کا سالِ تصنیف ترتیب ۱۱۷۵ھ/۶۲۔۱۷۶۱ء ہے اس لئے اس کا نام بقیدِ تاریخ''چمنستانِ شعراء'' رکھا گیا۔''

(شعرائے اردو کے تذکرے۔سید حنیف نقوی، ص۔۱۷۲)

مولوی قدرت اللہ قدرت اور شوق کے تذکرے''طبقات الشعرا'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں شعراء کے حالات زندگی، شخصیت اور سیرت کے ساتھ شاعری کے فن ترتیب کے ساتھ بخوبی بیان کیا گیا ہے۔یہ تذکرہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں اردو زبان، دکن کے شعرا اور شمالی ہند کے شعرا کے بارے میں لکھا گیا ہے۔دوسرے حصے میں ان شاعروں کے بارے میں لکھا گیا ہے جو ایہام گو تھے۔تیسرے حصے میں نئے شعر کے بارے میں لکھا گیا اور چوتھے حصے میں کچھ مقالے لکھے گئے ہیں۔اس تذکرے میں بارے میں حنیف نقوی کا خیال ہے کہ شعرائے اردو کے تذکروں میں طبقات الشعرا کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔میر حسن کا'' تذکرہ شعرائے اردو'' کا دائرہ بہت محدود ہے۔اس تذکرے کے ذریعہ میر حسن کے ناقدانہ صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ میر غلام حسین شورش کا''تذکرہ شورش''ابوالحسن امیر الدین احمد کا تذکرہ''مسرت افزا''اسد علی تمنا کا تذکرہ''گل عجائب'' کی خوبیوں اور خامیوں کو حنیف نقوی نے واضح طور پر پیش کیا۔علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرے''گلزار ابراہیم'' کے سنہ تالیف ۱۷۸۴ء ہے۔اس تذکرے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں غزل کے علاوہ دوسرے اصناف سخن پر توجہ کی گئی اور شعرا کے حالات زندگی پر زور دینے کے بجائے ان کے شعری کمال اور شاعرانہ خوبیوں پر زور دیا گیا۔مرزا کاظم ولا لکھنوی کے تذکرے'' گلشن سخن'' کے متعلق حنیف نقوی لکھتے ہیں کہ یہ تذکرہ گلزار ابراہیم اور تذکرہ شورش سے بہت زیادہ متاثر ہو کر لکھا گیا جس کے سبب یہ ان کی نقل نظر آتا ہے۔

چھٹے باب میں انھوں نے''تذکرہ ہندی'' سے''تذکرہ بے جگر'' تک تذکروں کو ترتیب کے ساتھ پیش کیا۔مصحفی کے''

تذکرۂ ہندی'' کی سنہ تالیف ۹۵/۱۷۹۴ء ہے۔حنیف نقوی نے مصحفی کے ناقدانہ صلاحیتوں اور علمی لیاقت کی تعریف کی ہے۔ مصحفی کے تزکرے کے ذریعہ اس وقت کے سماجی اور تہذیبی شعور سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ مصحفی کا تذکرہ میں ''ریاض الفصحا'' لکھنؤ کے ادبی ماحول، اردو زبان کی مقبولیت اور مشاعروں کی تصویر بخوبی پیش کی گئی ہے۔مرزا علی لطف کا تذکرہ ''گلشن ہند''، وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی کا ''تذکرہ عشقی''، غلام محی الدین عشق و مبتلا میر تھی کا تذکرہ ''طبقات سخن'' اور خیراتی لال بے جگر کا ''تذکرہ بے جگر'' کے بارے میں انھوں نے مختلف تحقیقی شواہد پیش کیے۔جس کی بنا پر ان تذکروں کی سنہ تالیف کے ساتھ خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔طبقاتِ سخن کے متعلق لکھتے ہیں:۔

''طبقاتِ سخن'' اس تذکرے کا تاریخی نام ہے جس سے اس کا سال ترتیب ۱۹۲۲ء برآمد ہوتا ہے۔علاوہ بریں مولف کا یہ بیان بھی موجود ہے کہ انھوں نے اس میں شعرائے عہدِ سلطنتِ محمد شاہ بادشاہ تا زمان جلوس سنہ عہد محمد اکبر شاہ.....مطابق سنہ ہزار دو صد (و) بست (و) دو ہجری'' کے نتائجِ طبع کو جگہ دی ہے۔نسخۂ شاہجہاں پور میں مولوی قدرت اللہ شوق سے متعلق ایک بیان کے علاوہ ایسا کوئی اشارہ موجود نہیں جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اس میں ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء کے بعد بھی کوئی اضافہ ہوا ہے۔شوق کے بارے میں مبتلا نے گنگا پرشاد رند شاگرد جرأت کا یہ بیان نقل کیا ہے:۔''ہر گاہ در خدمتش وارد شدم، استفسارِ احوال من کردہ پرسید کہ فیضان جن از صحبتِ کدام کس حاصل کردۂ؟ گفتم: چندے غزل را ازمیان جرأت صاف نمودہ ام، باقی فیضان صحبت نذیر الدین حسن شائق است۔او بجواب ناصواب درحقِ جرأت پیش آمد و برمند بدگذشت۔آخرش شوخی کردہ بعض ابیات غزلیاتش را اعتراضاتِ صحیحہ برداشتم کہ ہم دریں عرصہ مشارالیہ بہ اجل طبعی بمرد۔'' حکیم احمد خاں فاخر کے قطعۂ تاریخ روسے شوق کا انتقال ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) میں ہوا ہے۔اگر حکیم صاحب موصوف سے شوق کے سال وفات کے تعین اور رند سے اس واقعے کے بیان میں کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے تو ''طبقات سخن'' میں شوق کا حال یقیناً ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء کے بعد لکھا گیا ہوگا۔نسخۂ شاہجہاں پور کے برخلاف نسخۂ برلن میں متعدد شواہد موجود ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اضافے ہوتے رہے ہیں یا کسی خاص زمانے میں بڑے پیمانے پر نظر ثانی کی گئی ہے۔''

(شعرائے اردو کے تذکرے۔سید حنیف نقوی، ص۔۵۳۰)

ساتویں باب میں جن تذکروں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ان کے نام ''عیار الشعرا''، ''عمدہ منتخبہ''، ''مجموعہ نغز'' اور ''گلشن بے خار'' ہے۔تذکرہ ''عیار الشعرا'' ذکا دہلوی کی تالیف ہے۔اس تذکرے میں معروف اردو شعرا کے ساتھ غیر مسلم اردو شعرا کی تعداد زیادہ ہے۔''عمدہ منتخبہ'' میر محمد خاں سرور کا تذکرہ ہے۔اس تذکرے میں معروف اور غیر معروف شعرا کی تعداد یکساں ہیں۔'' مجموعہ نغز'' قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ ہے۔اس تذکرے کی خوبی اس کا منفرد اسلوب ہے۔نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا تذکرہ ''گلشن بے خار'' ہے۔اس تذکرے کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اس سے بہت سے قدیم تذکروں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔اس تذکرے میں ۶۷۶ شعراء کرام کا ذکر کیا گیا ہے۔حنیف نقوی کے مطابق اس تذکرے کی خامی پر تکلف اسلوب ہے۔حنیف نقوی اردو شعرا کے تذکروں کی اہمیت وافادیت کے قائل ہیں اور تذکروں کے متعلق ولکھتے ہیں:۔

''تذکرے اپنی بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہماری علمی وراثت کے امین، ہمارے ادبی ذوق کے ترجمان، ہماری تہذیبی سرگرمیوں کے عکاس اور ہماری مجلسی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ان کے اوراق خود شناسی وخودگری کے اس جذبۂ صادق کے گواہ ہیں جس نے اہل ہند کے سامنے ایران کی لسانی محکومیت سے آزادی کا تصور پیش کیا، عوام کو باہمی رابطے کے لیے ایک مہذب اور شائستہ زبان عطا کی، ملک کے مختلف طبقوں کے درمیان ذہنی وفکری ہم آہنگی ویکجہتی کے ایک نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک

ہمہ گیر و ہمہ رنگ، لالا کا روسدا بہار تہذیب کو جنم دیا۔ تہذیبی شناخت کی صورت گری کے اس حوالے سے اردو کی توسیع و ترقی کے لیے کی گئی کوششوں کی روداد جب بھی قلم بند کی جائے گی، تذکروں سے دامن بچا کر گذر جانا ممکن نہ ہوگا۔''

(شعرائے اردو کے تذکرے۔ سید حنیف نقوی، ص۔ ۲۷)

اس طرح ''شعرائے اردو تذکرے'' کے مطالعے سے حنیف نقوی کا تحقیقی اور تنقیدی شعور واضح ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اردو تذکرہ نگاری کے لیے جو اصول متعین کیے اسے اپنی کتاب میں عملی طور پر پیش کیا ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب اردو کی تذکراتی تحقیق میں اضافے کا حکم رکھتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر سعدیہ جعفری
گیسٹ لکچرر، شعبہ عربی و فارسی
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

داستان نویسی اور کلیلہ ودمنہ

چکیدہ: داستان کے لغوی معنی قصہ کہانی اور افسانہ کے ہیں۔ خواہ وہ منظوم ہو یا منثور۔ جس کا تعلق زمانہ گزشتہ سے ضرور ہو اس میں فطری اور حقیقی زندگی بھی ہو سکتی ہے اور اس کے علاوہ غیر فطری اکتسابی اور فوق العادت شاذ و نادر فوق العجائب بھی ہو سکتے ہیں۔ داستان سے کسی مخصوص دور اور عہد کے تہذیب و تمدن کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک چیز کا سرچشمہ علم یہی صنف ادب یعنی داستان ہے۔ یہ داستانیں انسان کے علم و آگہی کا بھی بہترین ذریعہ ہیں۔ سچ تو یہ ہے داستان گوئی کا تصور انسان کی سماجی زندگی کا آئینہ پیش کرتا ہے۔ داستانوں کے ذریعہ نہ صرف تہذیب و تمدن کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ سراغ بھی ملتا ہے کہ اشرف المخلوقات کے علم و آگہی کا ایک اہم سرچشمہ یہ داستانیں ہیں۔ داستان میں دلچسپی رکھنے کے لئے محیر العقول عجائب و غرائب اور مافوق الفطرت قوتوں کے مظاہرے ہوتے ہیں، جن سے ہماری زندگی یکسر خالی رہتی ہے۔ داستان نگار کی یہ کوشش رہتی ہے کہ جو واقعات بیان کئے جائیں ان کو سن کر لوگ حیران رہ جائیں۔ اسی طرح کی ایک داستان کلیلہ و دمنہ بھی ہے جس پر یہ مقالہ محیط ہے۔

کلیدی الفاظ: داستان، قصے، کلیلہ و دمنہ، سنسکرت

قصے میں دلکشی کے اضافے کی غرض سے کچھ ایسی گتھیاں پڑ جاتی ہیں اور پھر کچھ ایسے انداز سے سلجھ جاتی ہیں کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ سحر و ساحری، طلسم بندی اور طلسم کشائی، اسراریت کے ساتھ ساتھ جنسی لگاؤ کے واقعات بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ تعلیم اخلاقی اور تہذیب نفس پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ اسلوب بیان میں سنجیدگی کے پہلو بہ پہلو مزاح سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ غرض داستان ہمارے دل میں ہمدردی، خوف، نفرت، محبت اور مذاق کے جذبات کو پیدا کرتی ہے۔ داستان اپنے قدیمی رنگ کے ساتھ ساتھ شعوری بامقصد ادب سے ہٹ کر ایک ایسا فنکارانہ نظام تخلیق کرتا ہے جس میں اتحاد عمل اور اتحاد اثر کی کوئی خصوصی ضرورت کا لحاظ نہیں ہوتا۔ یہ طریق کار تمام قدیمی روایات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جس میں عربی و فارسی کی داستانوں سے لے کر سنسکرت اور دیگر زبانوں کے ادب میں واضح اور صاف نظر آتا ہے۔ اس کی ضمنی کہانیاں اپنے آپ میں مکمل اور آزاد ہونے کے باوجود اس داستان کا ایک پہلو پیش کرتے ہوئے شامل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح یہ ضمنی کہانیاں یا قصے کا جز و معلوم ہوتی ہیں جس میں داستان کا ہیرو مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ کہانیوں کی بنیاد کسی اخلاقی موضوع پر ہوتی ہے۔ ان اخلاقی کہانیوں (fables) میں بہت سی کہانیوں کے ہیرو انسان نہیں ہوتے مثال کے طور پر ''کلیلہ ودمنہ'' میں اس کے مجموعی خاکے کے علاوہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی اس میں شامل ہیں اور ان کہانیوں کے سبھی کردار شیر، گیدڑ، لومڑی، خرگوش، گائے اور گدھے وغیرہ ہیں۔ یہ سب کے سب اخلاقی (Fables) ہیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں داستان انسانی نفسیات کا بھرپور نمونہ ہوتی ہے۔اوراس میں انسانی خصوصیات کی نمائندگی اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ داستان کا موضوع کچھ بھی ہواس میں مہمات، اسراریت، سحر وطلسم، ادبی شان، شاعرانہ فضا، عشق ومحبت، عیاری وغیرہ ہر چیز ہوتی ہے۔کچھ داستانیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں اخلاق آموزی، تہذیب نفس، عالمانہ دقیقہ سنجی، مذہب اور تبلیغ پر زور دیا جاتا ہے۔داستان کا بنیادی اثر سننے یا پڑھنے والے پر چونکہ بھرپور پڑتا ہے اس لئے داستانوی ٹکنیک کو کلچرل، اخلاقی اور دیگر مسائل کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے تاکہ سننے یا پڑھنے والوں کو ان داستانوں کو درس آموز کلیات کے طور پر شعوری یا غیر شعوری طریقے سے ذہن نشین کرایا جاسکے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ داستانوں میں اخلاقی تعلیم یا مذہبی عناصر بھی موجود ہوتے ہیں یعنی معلمین اخلاق اور علمبرداران مذاہب نے بھی داستان کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا ہے ان کے ایسا کرنے کی وجہ شاید یہ ہوسکتی ہے کہ اخلاق و مذہب کے مبادیات تفریحی مطالعے کے طور پر آسانی سے سمجھائے جاسکتے ہیں۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ داستان کی اصل اور اہم ترین غرض سبق آموزی ہے اور تفریح طبع ثانوی درجہ رکھتا ہے۔

داستان سے انسان کا اپنے ماضی قریب اور ماضی بعید سے رشتہ وتعلق خاطر قائم رہتا تھا اور وقتاً فوقتاً اس میں مزید استحکام پیدا ہوتا رہتا تھا۔ظاہر ہے کہ اس کا واحد ذریعہ داستان سرگزشت اور کہانی ہی تھے اسلئے اس سے دلچسپی بھی برابر قائم رہی اور انسان کو اس کی ضرورت بھی محسوس ہوتی رہی۔اس طرح داستانوں سے ہم کو جو اطلاعات ملتی ہیں ان سے اگر سچائی واضح طور پر نہ بھی معلوم ہوتی ہو تب بھی اس دور کی ایک موہوم سی تصویر ضرور سامنے آتی ہے۔داستانوں میں جابجا بعض اہم اشارات بھی ہوتے ہیں جن سے تاریخ کے دور قائم کئے جاسکتے ہیں۔اور قابل ذکر امتیازات قائم ہوسکتے ہیں۔تہذیب وتمدن کا پتہ چل سکتا ہے، جس سے تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔یہ امر حقیقی ہے کہ قومی یا سماجی افکار یا تاثرات کو محفوظ رکھنے کا بہترین طریقہ اس کے ادبی شہ پارے ہوتے ہیں۔جنھیں موضوع وعنوان کے متعلق کچھ ذخیرہ چاہئے یا کسی زمانے کی تہذیب وثقافت کا مطالعہ کرنا ہو تو اس کے ادب کے اوراق پلٹنے سے سب کچھ حاصل ہوجاتا ہے۔جس میں داستان کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔دنیا کی ہر زبان میں عوامی ادب کا حصہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔اس کے بغیر کسی ملک کے تہذیبی اثاثہ کی تکمیل نہیں ہوتی۔یہ عوامی ادب اساطیری قصے، لوک گیت اور عوامی کہانیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ داستانوں نے ہر دور کو کم وبیش متاثر کیا ہے۔جب انسان اپنی آرزوؤں کی تکمیل میں خود کو بے بس پاتا ہے تب اسے مایوسی سے بچنے کے لئے کوئی سہارا درکار ہوتا ہے یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب اسے طلسماتی دنیا ذہنی سکون فراہم کرتی ہے داستانوں میں ایسی فضا تیار کی جاتی ہے جس کا عام زندگی سے کوئی ربط نہیں ہوتا۔داستانیں وقت گزاری اور تفریح طبع کے لئے بہتر ذریعہ ثابت ہوتی ہیں اور اس میں دلچسپی ودلبستگی کے سارے لوازم موجود ہوتے ہیں اس کے ساتھ ہی نصیحت مذہب اور اخلاق کی تبلیغ بھی ہوتی ہے انسانیت، فیاضی، دوستی، ہمدردی، شجاعت اور نیکی کی بھی تلقین پائی جاتی ہے۔تہذیب ومعاشرت کی اس مرقع کشی کی تاریخی اہمیت تو ہے ہی ایک اور اہمیت بھی ہے۔اابتدا میں زور دیا جاچکا ہے کہ داستان کہنا ایک فن ہے۔مقرر یا راوی کا مسئلہ صرف یہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے بلکہ اس کے لئے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کس سے کہہ رہا ہے۔اس آگہی کے بغیر سننے والے کو پوری طرح متوجہ کرنا اسے ساتھ لے کر چلنا ممکن نہیں۔داستان گو اس نقطے سے واقف تھے۔اسی لئے وہ پیشکش اور مواد (Matter) دونوں میں سامعین کی دلچسپی، مزاج، ماحول، تہذیب اور معاشرت کا لحاظ رکھتے تھے۔داستان میں اصلیت کا رنگ، ہم عصر تہذیب و معاشرت کی مرقع کشی کے سبب سے بھی پیدا ہوتا ہے۔اس کی اہمیت کے دو پہلو ہیں۔ادبی اور افسانوی۔ادبی پہلو انشاء منظر نگاری

اور تہذیبی بیانات وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔افسانوی پہلو سے مراد قصہ پن ہے کیونکہ داستانوں کا مطالعہ کرتے وقت ہمارے اندر غیر شعوری طور پر ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ہمارے دل و دماغ دونوں کو مسحور کرتی ہے۔اس تاثر کا رخ اخلاقی بھی ہے۔داستانوں میں جا بجا اہم عصر معاشرت کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔جو داستانیں سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہوئیں ان میں قدیم ہندوستان کے جلوے نظر آتے ہیں۔غرض کہ داستانیں ماضی کے ورثہ کی بیش بہا متاع ہیں۔اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بڑی تیزی سے نثر کو دل نشین اور دلنواز بنایا اس میں متعدد اسالیب (Style) کے کامیاب تجربے کئے گئے ہیں۔داستان میں حکایات اور روایات کی بنیاد حکمت، پند و نصائح کے بیان اور سماجی و تعلیمی مباحث پر ہوتی ہے۔اس میں لکھنے والا اپنی بات کی تصدیق کے لئے عموماً حقیقی یا مصنوعی حکایتوں کا سہارا لیتا ہے اور ان کہانیوں کو گواہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔اس قسم کی داستانیں ایران میں بہت پہلے سے رائج تھیں اس موضوع پر لکھی گئی اولین کتابوں میں سے ایک کلیلہ و دمنہ ہے۔ داستان گو کا انداز اس کی قوت بیان، علمیت اور خطابت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔قصہ خوان اپنے وقت تخیل اور انداز بیان کے امتزاج سے ایک نئی دلکشی پیدا کرتا ہے۔

ہندوستان ہمیشہ سے قصہ کہانیوں کا ملک رہا ہے۔ یہ دیوی دیوتاؤں کی جنم بھومی ہے۔ یہاں رامائن، مہابھارت، ہت اپدیش جیسے قصے کہانیوں نے جنم لیا۔ پنچ تنتر سے جو کہانیاں لی گئی ہیں ان میں ہت اپدیش بھی اہم مرتبہ رکھتی ہے۔ پنچ تنتر کا بنیادی پلاٹ جس کے تحت بہت سی چھوٹی چھوٹی کہانیاں ایک کے بعد ایک اکٹھا کر دی گئی ہیں، پنچ تنتر کی بنیاد پر ہی برھت کتھا، کتھا سرت ساگر اور ہت اپدیش جیسی کہانیاں وجود میں آئیں۔ ہندوستانی ادب میں بھی کہانیوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ملتا ہے۔جس میں قدامت اور انداز بیان میں پنچ تنتر کو (200 B.C.) دنیائے ادب میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔اس کو وشنو شرما نے کشمیر میں لکھا اس میں کہانیوں کا سلسلہ جانوروں کی زبانی تحریر کیا گیا ہے۔جس کی شہرت ایران تک پہنچی (538-39AD) میں ایران کے وزیر برزویہ نے اسے پہلوی زبان میں شاہان ایران کے لئے منتقل کیا۔

قبل اسلام داستان نویسی کی مثالیں عربی زبان میں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہاں جن قصے کہانیوں کا چلن ملتا ہے وہ بالخصوص تفریح طبع کے لئے مخصوص کئے جا سکتے ہیں۔ان داستانوں میں باطل پرستی، ہیرو ورشپ اور شخصیت پرستی جیسے مضامین ہیں۔جن میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ظہور اسلام کے بعد عرب مملکت کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا اور دیگر اقوام کے اختلاط سے عربی زبان و ادب میں مفکرین و ادباء کا دائرہ اقتدار وسیع تر ہوتا چلا گیا جس کی وجہ سے وہ تمام علماء جو عرب نہیں تھے اور عربی زبان میں ترقی کر چکے تھے اور ان کے شاہکار عربی ادب میں ایک اہم حیثیت رکھتے تھے ان میں سب سے زیادہ ایرانی علماء تھے۔عہد عباسی میں ایرانیوں کو خاص اہمیت حاصل تھی اس لئے عربی زبان میں ان تمام قصوں کی اہمیت بڑھ گئی جو پہلے ایرانی اور یونانی درباروں کی زینت تھے۔ جن میں پہلی کتاب کلیلہ و دمنہ ہے۔اس کو عبداللہ بن مقفع نے پہلوی زبان سے عربی میں ترجمہ کیا۔ پہلوی میں یہ کتاب سنسکرت سے ترجمہ ہو کر حکیم بیدپای کے نام سے پہنچی تھی۔کلیلہ و دمنہ کے طرز پر عربی میں لکھی جانے والی دوسری کتاب الصادح والباغم بھی قابل ذکر ہے۔اس انداز کی ایک اور نسبتاً کمزور کوشش ''فاکھۃ الخلفاء و مفاکھۃ الظرفاء'' ابن عرب شاہ دمشقی (854AD) کی تالیف ہے۔اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے قطع نظر کلیلہ و دمنہ کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ جانتکوں کے بعد حیوانی کہانیوں کا سب سے بڑا سرمایہ پنچ تنتر میں محفوظ ہے۔ یہ دنیا کی مشہور و مقبول کہانیوں میں سے ایک ہے۔۲۰۰ ق۔م۔میں کشمیر کے وشنو شرما نے اسے مرتب کیا تھا۔اصل نسخہ تو اب دستیاب نہیں لیکن اس کی کہانیاں دوسری کتابوں میں موجود ہیں اور دلچسپی سے پڑھی جا رہی ہیں۔کلیلہ و دمنہ کے مرکزی کردار عام طور سے پرندے یا جانور ہیں جو انسانوں کی طرح بولتے ہیں سوچتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔اس میں جانوروں کی زبان میں اہم سیاسی اور معاشرتی مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔اس کے دس باب میں کلیلہ و دمنہ میں قصے میں تخیل کے عمل دخل کے

حوالے سے بھی ایک بات غور طلب ہے کہا جاتا ہے کہ داستان میں بڑے پیمانے پر تخیل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔جس کا حقیقی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں۔کلیلہ ودمنہ کے عربی ترجمہ کا ذکر بھی ضروری ہے اس کا اصل سنسکرت کی مشہور کتاب پنچ تنترا ہے۔جسے نوشیروان کے حکم سے اس کے طبیب برزویہ نے پہلوی میں کلیلہ کے نام سے پیش کیا۔اس ترجمہ کو جب عبداللہ بن مقفع نے عربی میں منتقل کیا تو تمثیلی کہانیوں کے اس مجموعہ کو بہت پسند کیا گیا،کلیلہ ودمنہ حکمت وفلسفہ کے مسائل پر مبنی ایک جامع کتاب ہے اور اس میں انھوں نے سماج کے حالات کو پند ونصائح کی آمیزش کے ساتھ پرندے اور جنگلی جانوروں کی زبان میں بیان کیا ہے تا کہ عقلمند اور دانشوران کے فلسفوں اور حکمت آموز نصائح سے استفادہ کریں۔اور نادان اور بے وقوف اسے محض افسانہ اور قصہ سمجھ کر لطف اندوز ہوں۔اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں طرز بیان کی سادگی اور سلاست وروانی کا زور ہے جس میں شگفتگی بھی ہے اور تاثر بھی۔اس کتاب کے ذریعہ مصنف نے اپنی شعوری قوتوں کو ترسیل وابلاغ کا ذریعہ بنایا ہے۔کلیلہ ودمنہ کو ایک ایرانی طبیب برزویہ نے سنسکرت کی تصنیف کرنک ودمنک سے پہلوی کا جامہ پہنایا۔پہلوی سے دوسری صدی کے ایک مشہور مترجم مصنف عبداللہ بن مقفع نے عربی میں منتقل کیا۔

نصر بن احمد سامانی کے دور میں یہ کتاب پہلے فارسی میں ترجمہ ہوئی پھر رودکی نے اسے نظم کا جامہ پہنایا۔رودکی کی اہم تصنیف منظوم کلیلہ ودمنہ تھی جس کی اصل کو ایک ایرانی عالم ابن مقفع نے پہلوی سے عربی میں منتقل کیا تھا۔رودکی کی منظوم تصنیف اب ناپید ہے۔اس کے کچھ شعر فرہنگ اسدی طوسی اور تحفۃ الملوک میں ہم تک پہنچتے ہیں۔اس خدمت کے لئے اسے بادشاہ سے چالیس ہزار درم بھی ملے تھے۔

چھٹی صدی میں ابوالمعالی نصر اللہ بن محمد بن عبدالحمید منشی نے پھر اسے بلیغ فارسی نثر میں بہرام شاہ غزنوی کے زمانے میں مرتب کیا اور یہ کتاب کلیلہ ودمنہ بہرام شاہی کے نام سے مشہور ہوئی ابوالمعالی نصر اللہ بن عبدالحمید نے کلیلہ ودمنہ کو بہرام شاہ کے نام سے معنون کیا اور اس میں عربی وفارسی امثال اور اشعار کا اضافہ کیا۔حقیقت یہ ہے کہ اس نے نہایت سنجیدہ اور عمدہ نثر میں یہ کتاب لکھی۔اس لئے یہ کتاب فارسی کی ادبی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔نصر اللہ نظم میں مہارت رکھتا تھا اور عربی وفارسی میں اشعار لکھے ہیں۔بقول ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا یہ کتاب (536-568AD) کے درمیان تصنیف ہوئی کلیلہ ودمنہ کو دوبارہ مرتب کیا گیا۔پہلی مرتبہ انوار سہیلی کے روپ میں کمال الدین حسین واعظ کاشفی سبزواری نے یہ کام انجام دیا۔

کلیلہ ودمنہ کی دوسری شکل سند بادنامہ ہے، جو ابن علی الظہیری سمرقندی نے لکھی۔اس میں سات وزیروں کی حکایتیں درج ہیں۔کلیلہ ودمنہ کی طرح مرزبان نامہ بھی ہے جو اسی کا چربہ ہے۔اس میں بھی حیوانی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔مرزبان نامہ اگر چہ اس کتاب کا ترجمہ نہیں ہے مگر یہ بھی حکایتوں اور داستانوں پر مشتمل ہے جس میں بیشتر حکایتیں کلیلہ ودمنہ ہی کی طرح حیوانون کی زبان میں بیان کی گئی ہیں۔یہ کتاب چوتھی صدی ہجری کے آخر میں طبرستان کے حاکم مرزبان بن رستم نے طبری زبان میں لکھی۔فارسی میں اس کے دو ترجمے ہوئے۔ایک محمد بن غازی نے کیا اور وہ روضہ العقول کے نام سے مشہور ہے۔یہ ترجمہ بھی پر تکلف فارسی نثر میں ہے اور گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔دوسرا ترجمہ ساتویں صدی کے ابتدای سالوں میں سعیدالدین نے طبری مرزبان نامہ کو پر تکلف فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام بھی مرزبان نامہ رکھا۔یہ ترجمہ نو ابواب پر مشتمل ہے۔اصل کتاب کے بعض حصے سعیدالدین نے ترجمے میں حذف کر دیئے۔یہ ترجمہ بھی فارسی کی نثر کی شاہکاروں میں شمار ہوتا ہے۔اس کی نثر شعریت سے معمور ہے۔اس کی عبارت میں ایسی تشبیہات ملتی ہیں جو اس سے قبل صرف اشعار ہی سے مخصوص تھیں۔اسمیں عربی فارسی اشعار واقوال بھی کافی استعمال ہوئے ہیں۔کلیلہ ودمنہ تمثیلی قصوں کے انداز کی حکمت عملی کی مشہور سنسکرت کتاب پنچ تنترا کا فارسی ترجمہ ہے۔اولا ملا واعظ حسین کاشفی

نے یہ ترجمہ کیا تھا اور اس کا نام انوار سہیلی رکھا۔لیکن سخت الفاظ واستعارات کی وجہ سے یہ ترجمہ اس قدر مشکل اور پیچیدہ ہو گیا تھا کہ اس کا سمجھنا آسان نہ تھا۔

اکبر نے ابوالفضل کو حکم دیا کہ اصل سنسکرت کو سامنے رکھ کر ایسی عبارت میں ترجمہ کیا جائے کہ اس کے پند ونصائح آسانی سے سمجھ میں آسکیں

ابوالفضل نے ۹۹۶ھ میں اس کو سرانجام دیا اور اس کا نام عیار دانش رکھا۔اکبر کے دور حکومت (۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء) میں قصے کہانی کی جو کتابیں ترتیب ہوئیں ان میں ابوالفضل کی عیار دانش کو سب سے زیادہ شہرت ہے۔عیار دانش کا سلسلہ ملا واعظ حسین کاشفی کی انوار سہیلی، نصر اللہ کی کلیلہ ودمنہ وغیرہ سے ہوتا ہوا پنچ تنتز تک پہنچتا ہے۔۱۵۰۵ء میں ملا حسین واعظ کاشفی نے عبداللہ ابن مقفع کی تالیف میں سے دو باب خارج کر کے انوار سہیلی کی تالیف کی۔اکبر کے زمانے میں ابوالفضل نے انوار سہیلی کی غیر ضروری تفصیلات کو قلم زد کر کے عیار دانش لکھی اور اس میں ابن مقفع کی کتاب کے وہ دونوں ابواب بھی شامل کر دیے جو ملا حسین واعظ کاشفی نے چھوڑ دیے تھے۔عیار دانش مولفہ ابوالفضل علامی کلیلہ ودمنہ کے عربی وفارسی نمونوں کی تہذیب وترتیب نو ہے۔

کلیلہ ودمنہ کے تراجم سے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک کتاب سے دوسری کتاب میں قصے کچھ اس طرح منتقل کئے گئے ہیں کہ قصوں کی نوعیت ایک ہونے کے باوجود ان میں طرز بیان کی تبدیلی کے علاوہ قصوں کے متن (Text) میں توارد (Repitation) کو بھی بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

یہ داستان اس قدر دلپذیر، سحر انگیز اور پرکشش ہے کہ اس نے اپنی پیدائش سے ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود انسانی دماغوں کو اپنی سحر کارانہ خصوصیات سے مسحور کر رکھا ہے۔مختصر یہ کہ کلیلہ ودمنہ انسان اور انسانی سماج کے ارتقاء کا آئینہ ہے۔

بہ حرفی می تو ان گفتن تمنای جہانی را
من از ذوق حضوری طول دارم داستانی را

☆☆☆

محمد افضل
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، جے این یو
ڈاکٹر اشتیاق احمد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی

بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کی ادبی و اجتماعی خدمات☆

چکیدہ: ارض ہندوستان رشکِ جناں اس لئے رہا ہے کہ حضرت آدم یہیں کی سرزمین سراندیپ پر اُتارے گئے جو کبھی اس کا حصہ رہا تھا۔ جنتی پرندہ مور کا مسکن یہی ہے۔ سنگِ اسود یہاں سے گزر کر کعبہ کی زینت بنا کیونکہ حضرت آدم جنت سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہاں مسلمانوں کی آمد سے پہلے ایک روحانی دنیا آباد تھی۔ بڑے بڑے رشی منی اس کی خاک سے اُٹھے اور دنیا کو پیغام الفت پہنچایا۔ یہ وہی سرزمین ہے جہاں سے میرِ عرب کو ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں۔ مذہب اسلام اس ملک میں جنوب کی جانب سے داخل ہوا لیکن فروغ شمالی حصہ کا مقدر ٹھہرا کیونکہ مسلم فاتحین ایران ہوتے ہوئے یہاں آئے تھے۔ جب مسلمانوں نے اس ملک میں قدم رکھا تو انہوں نے اس ملک کے باشندہ کو انسانیت، اخوت، ہمدردی، بھائی چارگی، امن دوستی، آشتی اور محبت و مودت کی تعلیم دی۔ یہ کارِ پیمبری انجام دینے والے لوگ یقیناً تاجر، سپاہی، شاہ اور دیپلومیٹ نہیں تھے بلکہ ''حزب اللہ'' اور ''اولیاء اللہ'' کا وہ گروہ تھا جنہیں فلاح انسانیت مراد تھی۔ مسلم فاتحین کی کامیابی میں بھی انہی اولیاء اللہ کا ہاتھ تھا کیونکہ انہوں نے فاتحین کی آمد سے قبل الفت کی بیج اس سرزمین میں ڈال دیا تھا۔ کونپلیں پھوٹ آئی تھیں لیکن ابھی پودے کو تناور ہونا تھا جو وقت کا متقاضی تھا۔ ان نفوس قدسی کا گروہ تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف دلوں کو مسخر کرتا رہا جو بعد میں اس ارض عریض و طولانی میں اسلامی سلطنتوں کے استحکام کا باعث ثابت ہوا۔ ایسے نفوس قدسیہ میں سرفہرست اسم گرامی بابا فرید گنج شکرؒ کا ہے۔

کلیدی الفاظ: بابا فرید، عالم، صوفی، خدمات، تعلیمات

برصغیر پاک و ہند میں ان صوفیاء عظام کو ایسے حالات کا سامنا تھا جن میں یہ سب ممکن نہ تھا۔ ایک طرف علماء ظاہر تھے جنہیں ان بوریہ نشینوں کی ہر دلعزیزی کھٹکتی تھی تو دوسری طرف ہندو معاشرہ تھا جن کے دلوں میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف نفرت تھی کیونکہ ان کے خیال کے مطابق مسلمانوں نے ان سے حکمرانی چھین کر ان پر غلبہ پالیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ذات پات اور اونچ نیچ کی تقسیم انکے خون میں رچی بسی ہوئی تھی اور تیسرے یہ کہ اس ہندو معاشرے میں فلسفہ اور تصوف کے مختلف مکاتب فکر پائے جاتے تھے۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کے وجود کی بقاء کی ایک ہی صورت تھی کی اسلام کا روحانی اور اخلاقی انقلاب برپا کیا جائے۔ ان برگزیدہ ہستیوں نے ایسا ہی کیا اور اپنی زندگیاں اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور بنی نوع انسان کی روحانی ترقی اور اخلاقی تربیت کے لئے وقف کر دیں۔ برعظیم پاک و ہند میں تحریک تصوف کے ان مجاہدوں کے مختلف سلسلے مصروف عمل رہے جن میں مشہور

ومقبول چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ ہیں۔ان تمام سلسلوں نے اپنی اپنی جگہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے نمایاں کارنامے انجام دیے۔ان میں قدیم ترین سلسلہ، سلسلۂ چشتیہ ہے۔زیرنظر مقالہ میں اس عظیم سلسلہ کے امام بابا فرید گنج شکر کی خدمات اور انکے مقام کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے جنھیں اس سلسلہ کے امام ہونے کا شرف حاصل ہے۔

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں ہندوستان کی فتح سے پہلے صوفیہ کے سلسلے وجود میں آ چکے تھے اور اپنے اپنے وقت پر ان میں سے ہر ایک کا فیض ہندوستان میں پہنچ چکا تھا لیکن ہندو پاک کی روحانی فتح، سلسلۂ چشتیہ کے حصہ میں آئی۔سلسلۂ چشتیہ کے برعظیم پاک و ہند میں پانچ مشہور و معروف اولیاء اللہ پیدا ہوئے ہیں جنہیں اس سلسلہ کا ''پنج تن'' بھی کہا جاتا ہے جو بالترتیب یوں ہیں خواجہ معین الدین چشتی، قطب الدین بختیار کاکی، بابا فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء اور خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی۔

شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر عام طور پر ''بابا فرید'' کے نام سے مشہور ہیں۔شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر کا شمار قرون وسطی کے مشائخ عظام میں ہوتا ہے۔چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی کا دور، جنگ و جدل اور ہنگاموں کا دور تھا۔اس فتنہ انگیز اور پرآشوب دور میں ہی شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر کے اجداد کابل سے ہجرت کر کے برعظیم پاک و ہند میں تشریف لائے۔تذکرہ نگاروں کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔جیسا کہ روضۃ الاقطاب میں لکھا ہے کہ بابا فرید کے دادا قاضی شعیب غزنی سے لاھور آئے[۱]۔جبکہ صاحب سیر الاولیاء، آپ کی آمد کابل سے لاہور بیان کرتے ہیں[۲]۔

قاضی شعیب اپنے تینوں فرزندوں (خواجہ جمال الدین سلیمان، خواجہ احمد، خواجہ سعد احمد) پیروکاروں اور اہل وعیال کے ہمراہ لاہور تشریف لائے اور پھر لاہور سے قصور ہوتے ہوئے کہتوال آئے۔قاضی شعیب جب قصور پہنچے تو قصور کے قاضی نے آپ سے ملاقات کی اور آپ سے بہت متاثر ہوا اور بادشاہ وقت کو ان کے حالات سے آگاہ کیا۔سلطان نے ہر طرح کی مدد کی پیشکش کی لیکن آپ نے فرمایا کہ:

''مارا از عمل دنیا ہیچ مطلوب نیست چیزے کہ از ما رفت دنبال آن نشویم''[۳]

(ہمیں دنیاوی کسی چیز کی طلب نہیں ہے کیونکہ جو چیز ہم سے چھن گئی ہم اس کے پیچھے نہیں پڑتے۔)

لیکن اس کے باوجود سلطان نے آپ کو کہتوال کا قاضی مقرر کیا اور قاضی شعیب قصور سے کہتوال منتقل ہو گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ان کے شجرۂ حسب ونسب کے حوالے سے بھی تذکرہ نگاروں کے یہاں اختلاف ملتا ہے۔صاحب سیر الاولیاء شجرۂ نسب کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

''شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز مقرر صاحبدلان عالم باداین بادشاہ اہل دین از دودمان شاہ کابل فرخ شاہ عادل بود''[۴]۔

(شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز فرخ شاہ عادل بادشاہ کابل کے شریف ونجیب خاندان کا روشن چراغ ہے۔)

سیر الاقطاب پہلا تذکرہ ہے جس میں شیخ فرید کا نسب نامہ درج کیا گیا ہے اسکے بعد مختلف تذکرہ نگاروں نے شیخ فرید گنج شکر کا نسب نامہ درج کیا ہے بعض نے کم اور بعض نے زیادہ واسطوں سے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملایا ہے۔

اللہ دیا چشتی نے سیر الاقطاب میں مندرجہ ذیل نسب نامہ تحریر کیا ہے

''حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر مسعود قدس اللہ تعالی سرہ ابن شیخ المعروف بفرخ شاہ کابل ابن نصیر فخر الدین محمود بن

سلیمان بن شیخ مسعود بن شیخ عبداللہ واعظ الاصغر بن واعظ الاکبر ابوالفتح بن شیخ اسحاق بن شیخ ناصر بن شیخ عبداللہ بن امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ''[۵]۔

صاحب سیر الاقطاب نے بابا فرید الدین کا شجرۂ نسب امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پندرہ واسطوں سے ملایا ہے۔بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے حضرت عمر فاروق تک کہیں انیس کہیں بیس اور کہیں چوبیس واسطوں سے سلسلہ نسب ملایا ہے ۔صاحب'' حدیقۃ الاولیاء'' نے سترہ واسطوں سے ابراہیم بن ادہم اور 23 واسطوں سے عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے شجرۂ نسب ملایا ہے[۶]۔

بابا فرید الدین گنج شکر کا سن ولادت اور سن وصال میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔بیشتر قدیم اور جدید دونوں تذکرہ نگاروں نے بابا فرید گنج شکر کا سال وصال 664ھ بتایا ہے جبکہ دیگر روایات کے مطابق 660ھ سے 760ھ کے عرصہ پر محیط بتلایا گیا ہے۔اس طرح سے ایک صدی کا فرقِ طولانی قائم ہوتا نظر آتا ہے جو کسی طرح کے تعین سے بعید اور ناممکن ہے۔مثال کے طور پر 660 سے 760ھ تک کے سلسلے میں چودہ روایات ملتی ہیں۔طوالت سے بچنے کے لئے میں یہاں اسکی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔

وجہ تسمیہ گنج شکر/شکر بار: بابا فرید الدین گنج شکر کے کئی القاب اور نام پائے جاتے ہیں لیکن ان سب میں گنج شکر یا شکر بار سب سے زیادہ مشہور ہے۔کتب سیر میں ان سب نام کے بارے میں مختلف روایات پائی جاتی ہیں۔

سیر الاولیاء نے روایت کی ہے کہ شیخ فرید الدین گنج شکر نے زیادہ مجاہدہ کرنا چاہا تو آپ نے اپنے مرید، قطب الدین بختیار کاکی سے اجازت چاہی، مرید نے حکم دیا طے کا طریقہ اختیار کرو، چنانچہ شیخ فرید نے تین روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا۔تیسرے دن افطار کے وقت ایک شخص چند روٹیاں لایا آپ نے غیب سے سامان افطار سمجھ کر کھالیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ایک چیل کو مردار کی آنتوں کے ٹکڑے منہ میں لئے دیکھا تو آپ کو فوراً متلی آئی اور وہ روٹیاں جو آپ نے کھائی تھی قے کی صورت میں نکل آئیں۔آپ نے یہ کیفیت اپنے مرشد، قطب الدین بختیار کاکی سے بیان کیا تو شیخ نے فرمایا! مسعود تم نے تیسرا روزہ شرابی کی روٹیوں سے افطار کیا تھا۔عنایت الٰہی کی وجہ سے وہ کھانا تمہارے معدے کے اندر جگہ نہ بنا پایا۔اب جاؤ اور تین روزے مزید رکھو اور جو چیز غیب سے پہنچے اس سے افطار کرو، چنانچہ بابا فرید نے دوبارہ روزہ رکھنا شروع کیا، بنا کھائے پیئے چھ دن ہو گئے۔روزہ مسلسل اپنی جگہ ادا ہوتا رہا لیکن کسی قسم کا کھانا غیب سے پیدا نہ ہوا یہاں تک کہ ایک پہر رات گذر گئی تو ضعف اور کمزوری غالب آ گئی، تب آپ نے دست مبارک زمین کی طرف دراز کیا اور چند کنکریاں اٹھا کر منہ میں ڈال لیں جو فوراً شکر بن گئیں۔آپ نے یہ سوچ کر کہ ممکن ہے یہ شیطان کا فریب ہے انھیں اگل دیا اور مشغول بحق ہو گئے۔جب آدھی رات گذر گئی تو آپ نے پھر ضعف کی وجہ سے کنکریاں منہ میں ڈالیں جو پھر شکر بن گئیں آپ نے انھیں شیطان کا مکر خیال کر کے منہ سے نکال پھینکا اور پھر عبادت میں مصروف ہو گئے۔رات کے آخری پہر آپ نے سوچا کہ مبادا ایسا نہ ہو کہ ضعف کی وجہ سے فجر کی نماز ادا نہ کر سکوں اس لئے ایک دفعہ پھر کنکریاں منہ میں ڈالیں جو حسب سابق شکر بن گئیں۔آپ نے اسے غیبی سامان سمجھ لیا کیونکہ تین دفعہ ایسا ہو چکا تھا۔صبح جب مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شیخ نے فرمایا۔

''مسعود! تم نے خوب کیا کہ شکر سے روزہ افطار کیا۔جو غیب سے میسر ہو بہر صورت خوب ہے جاؤ ہمیشہ شکر کی طرح شیریں رہو گے۔یہی وجہ ہے کی بابا فرید کو شکر بار یا گنج شکر کہتے ہیں[۸]۔''

اخبار الاخیار، خزینۃ الاصفیاء اور تذکرۃ العاشقین میں یہ روایت بیان ہوئی ہے کہ ایک سوداگر اونٹوں پر شکر لاد کر ملتان سے دہلی جا رہا تھا۔جب وہ اجودھن پہونچا تو شیخ فرید نے اس سے پوچھا، اونٹوں پر کیا ہے؟ سوداگر نے تمسخر میں جواب دیا ''بابا نمک

ہے'' آپ نے جواب دیا ''خیر نمک ہی ہوگا'' جب وہ منزل مقصود پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ شکر تو ہے ہی نہیں سب نمک ہوگیا ہے۔ وہ پریشان ہوگیا اور فوراً واپس اجودھن بابا فرید گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوکر معافی مانگا۔ بابا فرید نے فرمایا اگر وہ شکر تھی تو شکر ہو جائیگی۔ سوداگر واپس آیا اور دیکھا کہ نمک پھر شکر میں تبدیل ہوگیا۔

بیرم خان خاناں نے اس واقعہ کو شعر میں اس طرح ڈھالا ہے۔

کان نمک جہاں شکر شیخ بحر و بر آن کز شکر نمک کند واز نمک شکر [9]

(نمک کی کان، شکر کا خزانہ، خشکی و تری کے بادشاہ وہ جو شکر کو نمک اور نمک کو شکر بنا دیتا ہے)

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ کو بچپن سے شکر سے رغبت تھی آپ کی والدہ کہتیں جو بچے صبح کی نماز باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں اللہ تعالی اس بچے کو شکر دیتے ہیں اور چپکے سے شکر کی پڑیا آپ کے مصلی کے نیچے رکھ دیتیں۔ ایک دن ایسا کرنا بھول گئیں۔ آپ نے روزانہ کی طرح نماز کے بعد مصلی الٹا تو وہاں پہلے سے زیادہ شکر پایا۔ پوچھنے پر والدہ کو بتایا، انھوں نے کہا انشاء اللہ تو مثل شکر شیریں ہوگا۔ اس طرح آپ کا نام گنج شکر پڑ گیا [10]۔

بیعت وخلافت: شیخ فریدالدین گنج شکر کی اپنے پیرومرشد سے پہلی ملاقات ملتان میں مولانا منہاج الدین کی مسجد میں ہوئی، اس وقت آپ کی عمر اٹھارہ برس تھی۔ اس بات پر تو سبھی تذکرہ نگار متفق ہیں کہ پہلی ملاقات میں بیعت ہوئی اور اس وقت آپ کی عمر اٹھارہ سال تھی لیکن اس میں کافی اختلاف ہے کہ بیعت ملتان میں ہوئی یا دہلی میں۔ طوالت سے بچنے کے لئے ان سارے اختلاف کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔

صاحب سیر الاولیاء لکھتے ہیں کہ ایک دن شیخ اپنے مرشد خواجہ بختیار کاکی کی خدمت میں بیٹھے تھے جب اس نیت سے اٹھے کہ ہانسی روانہ ہوں تو آپ کے مرشد بختیار کاکی نے پرنم آنکھوں سے فرمایا، مولانا فریدالدین! میں جانتا ہوں کی تم ہانسی جاؤ گے، بابا فرید نے فرمایا: جیسا شیخ کا ارشاد ہو۔ شیخ نے فرمایا: قلم تقدیر یوں ہی چل چکا ہے کی جب میرا سفر آخرت ہو تم موجود نہ ہو پھر حاضرین کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا سب مل کر اس درویش کی دین و دنیا کی مزید نعمت اور فقر کے لئے سورہ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھو۔ اسکے ساتھ ہی شیخ الاسلام نے بابا فرید گنج شکر کو اپنا مصلی خاص اور عصا کیا اور ارشاد فرمایا! میں اپنا سجادہ، دستار، خرقہ اور نعلین بطور امانت، قاضی حمیدالدین ناگوری کو دے جاؤ نگا پانچویں روز یہ سب چیزیں تمہیں مل جائینگی پھر فرمایا:

''مقام ما مقام شما است'' [11]

جس روز خواجہ بختیار کاکی کا انتقال ہوا۔ بابا فریدالدین گنج شکر جو اس وقت ہانسی میں تھے، آپ نے خواب میں دیکھا کہ ان کے پیرومرشد کاکی، انھیں اپنے دربار میں بلا رہے ہیں۔ آپ صبح دہلی کے لئے روانہ ہوگئے، چوتھے روز دہلی پہونچے۔ قاضی حمید الدین ناگوری نے وہ جامہ آپ کے سپرد کیا آپ نے دو رکعت نماز ادا کر کے زیب تن کیا اور مرشد کے حکم کے مطابق ان کی مسند پر بیٹھ گئے [12]۔

اہل دہلی کو جب بابا فریدالدین مسعود گنج شکر کی دہلی آمد کا علم ہوا تو لوگوں کا ہجوم امڈ پڑا، جب آپ نے یہ حال دیکھا تو دہلی سے جانے کا ارادہ کیا گرچہ آپ کو ہانسی سے آئے ہوئے تین ہی دن ہوئے تھے کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے بابا فرید فوراً ہانسی کی جانب لوٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ اس کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہانسی لوٹ جانے پر آپ کو بالکل کمر بستہ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہانسی میں آپ کا ایک عقیدت مند ''سرہنگا'' نامی مجذوب تھا وہ آپ سے ملنے دہلی آیا لیکن دربان نے اسے آپ سے ملنے نہ دیا۔ جیسے ہی آپ نماز کے لئے باہر نکلے، سرہنگا بھاگ کر آپ کے قدموں میں گر گیا اور رو کر کہنے لگا:

''شما در ہانسی بودید من شمارا آسان میدیدم، این ساعت دیدن شمارا دشوار شدہ است۔''

(جب آپ ہانسی میں تھے تو آسانی سے آپ کی زیارت کر لیتا تھا اب آپ کا دیکھنا مشکل ہو گیا ہے)

سرہنگا کی بات سن کر بابا فرید آبدیدہ ہو گئے۔ آپ نے اسی وقت ہانسی واپسی کا اعلان کیا۔ وہ اپنے مرشد بختیار کاکی کی زندگی میں آپ کا زیادہ تر قیام ہانسی میں رہا لیکن ان کی وفات کے بعد آپ نے کچھ عرصہ ہانسی میں قیام کیا پھر اجودھن تشریف لے گئے۔

خیر المجالس میں تحریر ہے کہ جس قصبہ میں آپ جاتے، لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے قیام نہ فرماتے اور یہ فرماتے کہ مجھے ایسی جگہ رہنا پسند ہے جہاں کوئی میرا معتقد نہ ہوتا کہ میں فارغ البال ہو کر یاد الٰہی میں مشغول رہ سکوں[۱۳]۔

اجودھن اس لحاظ سے آپ کی خواہش اور پسند کے مطابق مقام تھا۔ جو جگہ بابا فرید نے اپنے لئے منتخب کی وہاں پسماندہ ہندو قبائل رہتے تھے۔ ہر جگہ خطرناک کیڑے رہتے تھے۔ یہ علاقہ سانپوں اور بچھوؤں کا مسکن تھا۔ شیخ فرید کو بھی ایک مرتبہ سانپ نے ڈس لیا لیکن آپ ذکر اللہ میں مشغول رہے جسم سے پسینہ کے ذریعہ زہر بہہ گیا اور آپ پر اثر نہ ہوا[۱۴]۔ آپ آخر عمر تک اجودھن میں قیام پذیر رہے۔ ایک روایت کے مطابق سولہ اور دوسری روایت کے مطابق چوبیس سال تک آپ نے اجودھن میں قیام فرمایا[۱۵]۔

بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کی حیات مبارکہ کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسی شمع ہدایت تھے جس نے کفرستان ہند کو اپنی تجلیوں اور حسن عمل و حسن خلق سے نہ صرف دور دور تک منور کیا بلکہ سلسلۂ چشت کو انتہائی عروج پر پہنچا دیا۔ جب خواجہ معین الدین چشتی اور قطب الدین بختیار کاکی کا وصال چند ماہ کے وقفوں سے ایک سال کے اندر ہوا تو سلسلہ کی بھاری ذمہ داری بابا فرید پر آ گئی۔ آپ نے اس ذمہ داری کو احسن طریقہ سے نبھایا اور سلسلے کی اشاعت کا کام عمدگی سے انجام دیا۔

امیر حسن سجزی، فوائد الفواد میں لکھتے ہیں کہ اسی دور میں بابا فرید کی خانقاہ سے تھوڑی دور سہروردی خانقاہ ملتان میں قائم تھی لیکن دونوں کے حالات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ بابا فرید عالم باعمل اور صوفی باصفا تھے۔ آپ کی خانقاہ کا دروازہ بلا امتیازِ مذہب و ملت ہر وقت ہر ایک کے لئے کھلا رہتا تھا جبکہ سہروردی خانقاہ ہر ایک کے لئے نہیں تھی، وہاں وہی ٹھہر سکتا تھا جسے اجازت ہوتی۔ ان کا دسترخوان بھی ہر ایک کے لئے نہیں تھا، صرف وہی لوگ ہوتے جنہیں دعوت دی جاتی[۱۶]۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ بہاؤالدین زکریا ہر وقت لوگوں سے نہیں ملتے بلکہ اوقات مقرر ہوتے، جبکہ بابا فرید سے ہر شخص ہر وقت مل سکتا تھا۔ آپ کی خانقاہ درویشانہ خانقاہ تھی جس میں سب کچھ تقسیم ہو جاتا جبکہ سہروردی خانقاہ میں باقاعدہ ذخیرہ اناج ہوتا، صندوق اور تجوریاں بھی موجود تھیں[۱۷]۔

بابا فرید گنج شکر بحیثیت شاعر: بابا فرید الدین مسعود گنج شکر اس میدان میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ آپ پہلے صوفی شاعر ہیں جنھوں نے شاعری کو اپنی تعلیمات کا ذریعہ بنایا۔ بابا فرید کو یہ انفرادیت بھی حاصل ہے کہ وہ پنجابی زبان کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ پنجابی کے علاوہ بابا فرید نے عربی، فارسی، اردو اور ہندوی میں بھی شاعری کی ہے لیکن ان کے کلام کا بیشتر حصہ بردِ زمانہ ہو چکا ہے اس کی باوجود فارسی کے جو کلام ملتے ہیں اس روشنی میں کچھ باتیں ہو سکتی ہیں۔ جیسا کہ عرض ہوا کہ بابا فرید کو فارسی زبان سے بے حد لگاؤ تھا اور وہ دیگر زبانوں کے مقابلے میں اس کو عزیز تر رکھتے تھے کیونکہ بقول صاحبِ ''انوار الفرید'' بابا فرید کی مادری زبان فارسی تھی[۱۸]۔ تذکرہ نگاروں نے بہت سے اشعار بابا فرید سے منسوب کئے ہیں لیکن ہم یہاں سیر الاولیاء جیسی مستند کتاب سے کچھ اشعار نقل کر رہے ہیں جنھیں بابا فرید کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ کریں:

ہر کہ در بند نام و آوازہ است خانہ او بروں دروازہ است[۱۹]

(جو شخص نام اور شہرت کی فکر میں ہے اس کا گھر، دروازہ سے باہر ہے)

بقدر رنج یابی سروری را بشب بیدار بودن مہتری را [۲۰]

(جس قدر رنج اٹھائیگا اسی قدر خوشحالی اور سرداری حاصل ہوگی اور شب بیداری سے تو بزرگی حاصل ہوتی ہے)

دوشینہ شبنم دل حزنیم بگرفت واندیشہ یار نازنینم بگرفت
گفتم بسر ودیدہ روم بر در تو اشکم بدوید وآستینم بگرفت [۲۱]

(کل رات شبنم نے میرے محزون ومغموم دل پر اثر کیا اور یار نازنین کے اندیشہ نے برانگیختہ کیا۔ میں نے کہا کہ آنکھ وسر کے بل تیرے دروازے پر چلنے کو تیار ہوں۔ اس وقت میرے آنسو بہے اور آستین کو پکڑ لیا)

اے مدعی بدعوی چندین مکن دلیری یک حرف راز معنی سہ صد جواب باشد [۲۲]

مولانا نظام یمنی، حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کے حوالے سے لطائف اشرفی میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''حضرت گنج شکر اکثر اوقات زبان خود را باین ابیات، شیرین می کرد:

خون بہائے عاشقان در روز وصل جلوۂ معشوق باشد وقت ناز
کشتگان دوست تا روز جزا تانہ پنداری بخود آیندہ باز [۲۳]

بابا فرید کے ملفوظات ''اسرار الاولیاء'' کے مندرجہ ذیل اشعار کو تقریباً سبھی تذکرہ نگاروں نے نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

☆ عشق تو مرا اسیر و حیران کردہ است درکوئے خرابات پریشان کردہ است
باین ہمہ رنج ومحنت اے دوست ببین اسرار تو دردلم پنہان کردہ است

☆ چو درویش را کار بالا کشید بہ یک لحظہ سر درثریا کشید
چنان غرق گردد بہ دریای عشق کہ یکدم سر از عشق بالا کشید [۲۴]

بابا فرید صوفی شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں انسانیت اور محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن ہے۔ ایک صوفی کا دل ہمیشہ عشق سے لبریز ہوا کرتا ہے خواہ وہ عشق اللہ ہو یا عشق خلائق، عشق ہر رنگ میں بھلا اور روشن ہوا کرتا ہے۔ وقت اور تقاضے عشق کی راہوں کو بدلتے ہیں لیکن ایک عارف کے نزدیک عشق عرفان ذات ہے کیونکہ عشقِ الٰہی اور اسرار ورموزِ کائنات کا واشگاف ہونا عرفان ذات کے سوا ممکن نہیں۔ صوفیاء کے دعوتِ عشق کا ڈھنگ بھی نرالا ہی ہوا کرتا ہے وہ خلائق خداوندی کو اس کی سمجھ اور فہم کی مطابق درس دیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ جو شخص جو زبان سمجھا ہوا سی زبان میں بات کی جائے۔ ان کے تیور حاکمانہ نہیں بلکہ فقیرانہ ہوا کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کی زبان عام فہم اور صاف اظہار وخیال کا ایک سادہ بیان ہے جس میں دور بینی، دردفہمی اور جہاں بینی کی دعوت ہے۔

بابا فرید نے فارسی، اردو، عربی اور پنجابی زبان میں شاعری کی ہے کیونکہ وہ کثیر الالسنہ تھے۔ آج زمانے کی افراتفری اور وقت کی اُتھل پتھل نے ان کے سرمایۂ شاعری کو ہم سے چھین لیا لیکن پنجابی زبان میں ان کی شاعری کے اشلوک آج بھی گرو گرنتھ کی شان بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں ویسے بھی آپ کا مقصد شاعری کرنا نہیں تھا، آپ کے سامنے ایک مشن تھا جسے ہم خدمتِ خلائق کا نام دے سکتے ہیں۔ بابا فرید کے پنجابی کلام کا وہ حصہ جو سکھوں نے اپنی مذہبی کتاب ''گرو گرنت صاحب'' میں شامل کرلیا ہے، اسے بعض لوگ ''شلوک'' بعض ''دوہے بابا فرید'' بعض دیگر ''آکھیا بابا فرید'' کے نام سے یاد کرتے ہیں، جبکہ ''گرو گرنت صاحب'' میں ایک مستقل باب ''شلوک بابا فرید'' کے عنوان سے شامل ہے۔

مختصر یہ کہ بابا فرید اسم بامسمیٰ تھے۔آپ کے اخلاق اور زبان کی حلاوت نے اس خطہ کے لوگوں کے دلوں کو شیرینی وچاشنی عطا کی، اہل ہنود کے دلوں سے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف کڑواہٹ اور تعصب کو دور کیا اور انہیں ایسا درس الفت پڑھایا کہ سب انسانیت کے قدرداں ہوگئے۔آپ کی ذات با برکات سے متاثر ہوکر لاکھوں مشرف بہ اسلام ہوئے۔آپ کی بردباری، شرافت، نجابت، لیاقت، دیانت، حلم اور تدبر اور شیریں زبانی وشیریں کلامی کے سامنے بڑے بڑے قبائلی سردار اور جاہ وحشمت والوں نے اپنی پگڑیاں اُتار کر آپ کے قدموں میں ڈال دیا۔یہ وہ تھے جنہیں مسلم فاتحین کی تلواریں سر نہ کرسکی تھی مگر وہ سب آپ کی مسکراہٹ کی دھار پر اپنے آپ کو قربان کر بیٹھے،اس درویش صفت انسان،ان کی تعلیمات،حسن عمل اور اخلاق کی مثال اس عہد میں نہیں ملتی۔آپ ایسے دور میں امن اور آشتی کا پیغام لائے جو جنگ وجدل اور تشدد کا دور تھا۔حقیقت یہ ہے کہ بابا فرید بحیثیت انسان، مبلغ اسلام، عالم، امام سلسلۂ چشتیہ، مصلح، زاہد، عابد، متقی، روحانی پیشوا غرضیکہ ہر پہلو اور ہر میدان میں اسم بامسمی اور فردِ فرید رہے۔آج رعایا پر حکومت کرنے والے شاہوں کا نام یاد نہیں آتا لیکن دلوں پر حکومت کرنے والا ایک درویش آج بھی زندہ وتابندہ ہے جسے خلائق بابا فرید گنج شکر کے نام سے یاد کرتی ہے۔

(☆) یہ مضمون، محمد افضل ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ذریعہ، ڈاکٹر اشتیاق احمد ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ فارسی جے این یو کی راہنمائی میں ایم فل کی ڈگری حاصل کرنے کیلئے پیش کئے گئے تحقیقی مقالہ کا ایک حصہ ہے۔

منابع ومآخذ:

(۱) محمد بلاق چشتی، روضۃ الاقطاب (اردو) مطبع محبّ ہند، دہلی، 1309ھ، ص65

(۲) میر خورد کرمانی، سیر الاولیاء (فارسی) ص69

(۳) میر خورد کرمانی، سیر الاولیاء (فارسی) ص69

(۴) میر خورد کرمانی، سیر الاولیاء (فارسی) ص68

(۵) اللہ دیا چشتی، سیر الاقطاب (فارسی) ص:163

(۶) مفتی غلام سرور لاہوری، حدیقۃ الاولیاء، لاہور، 1974، ص75

(۷) صوفیوں کے نزدیک متواتر روزہ رکھنے اور جب تک غیب سے افطاری کا سامان مہیا نہ ہو اس وقت تک روزہ افطار نہ کرنے کو طے کہتے ہیں

(۸)، میر خورد کرمانی، سیر الاولیاء (فارسی) ص78-77

اللہ دیا چشتی، سیر الاقطاب (فارسی)، 165-164

(۹) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار (فارسی)، ص53-52

مفتی غلام سرور لاہوری، خزینۃ الاصفیاء، ص293، ج اول بحوالہ تذکرہ فریدیہ، ص14

(۱۰) محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، جلد دوم، ص338

صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم صوفیہ، ص148

(۱۱) میر خورد کرمانی، سیر الاولیاء (فارسی)، ص83-82

اللہ دیا چشتی، سیر الاقطاب (فارسی)، 167

(۱۲) امیر حسن علا سجزی، فوائد الفواد (فارسی)، ص187-188

میر خورد کرمانی، سیر الاولیاء (فارسی) ص 83-82
(۱۳) حامد قلندر، خیر المجالس، (فارسی) ص 56، خیر المجالس (اردو) ص، 82
(۱۴) میر خورد کرمانی، سیر الاولیاء (فارسی) ص 90
(۱۵) میر خورد کرمانی، سیر الاولیاء (فارسی) ص 73
(۱۶) امیر حسن علا سجزی، فوائد الفواد، ص 136
(۱۷) امیر حسن علا سجزی، فوائد الفواد، ص 224-223
(۱۸) سید مسلم نظامی دہلوی، انوار الفرید، طبع ہفتم، لاہور، ص 395
(۱۹) میر خورد کرمانی، سیر الاولیاء (فارسی) ص 74
(۲۰) میر خورد کرمانی، سیر الاولیاء (فارسی) ص 74
(۲۱) میر خورد کرمانی، سیر الاولیاء (فارسی) ص 84
(۲۲) میر خورد کرمانی، سیر الاولیاء (فارسی) ص 85
(۲۳) مولانا نظام یمنی، لطایف اشرفی، ج دوم، ص 147
(۲۴) بدرالدین اسحٰق، اسرار الاولیاء، مطبع منشی نولکشور، کان پور، ص 40

فارسی مآخذ:

(۱) امیر حسن علا سجزی، فوائد الفواد، مطبع نول کشور، لکھنؤ، 1302 ھجری
(۲) اللہ دیا چشتی، سیر الاقطاب، نول کشور، 1913
(۳) بدرالدین اسحٰق، اسرار الاولیاء، مطبع منشی نولکشور، کان پور، سن اشاعت مجہول
(۴) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، مجتبائی پریس، دہلی، 1914
(۵) غلام سرور لاہوری، خزینۃ الاصفیاء، لکھنؤ، 1872
(۷) میر خورد، محمد بن مبارک کرمانی، سیر الاولیاء، چرنجی لال ایڈیشن، مطبع محبّ ہند، دہلی، 1302 ھجری

اردو مآخذ:

(۱) جعفر قاسمی، بابا فرید الدین مسعود گنج شکر، اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور، 1978
(۲) خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، نیو پبلک آفسٹ پریس دہلی، 1985
(۳) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم صوفیہ، مطبع معارف، دارالمصنفین اعظم گڑھ، 1971
(۴) سید نصیر احمد جامعی، حضرت بابا فرید گنج شکر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1984
(۵) نثار احمد فاروقی، نقد ملفوظات، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1983
(۶) واحد بخش سیال، مقام گنج شکر، ایور گرین پریس، لاہور، 1983
(۷) ہشت بہشت (ملفوظات خواجگان چشت) شبیر برادرز، لاہور، 2004

☆☆☆

ارمان احمد
ریسرچ اسکالر، شعبہ عربی،
بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

ملا محمود جونپوری

چکیدہ: شیراز ہند جون پور کو جن علما کی وجہ سے فخر حاصل ہے ان میں سے ایک نام ملا محمود جون پوری کا بھی ہے۔ ملا محمود عہد مغلیہ کے جید عالم تھے، دیگر علوم وفنون کے ساتھ حکمت وفلسفہ میں بلند مقام رکھتے تھے۔ آپ نے حکمت وفلسفہ کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا، آپ کی تصانیف اس بات کی گواہ ہیں۔ آپ کی تصانیف میں ''فرائد فی شرح الفوائد مع حاشیہ'' اور ''شمس بازغہ'' درس نظامی کے نصاب میں داخل رہی ہیں۔ آج بھی مدارس اسلامیہ میں علم وحکمت میں آپ کی مشہور زمانہ کتاب ''شمس بازغہ'' کی تدریس وتحصیل اساتذہ وطلبہ کے لیے باعث افتخار ہے۔

کلیدی لفظ: شیراز ہند، جونپور، ملا محمود، شمس بازغہ۔

دریائے گومتی کے کنارے آباد ایک چھوٹا سا شہر جونپور عہد وسطی میں اسلامی علوم وفنون کا گہوارہ رہا ہے۔ اس سرزمین پر حضرت عیسیٰ تاج، حضرت نصیر الدین گنبدی، حضرت عبدالقدوس قلندر، حضرت شیخ من اللہ عرف مخدوم اڈھن، حضرت قطب بینا دل قلندر، حضرت شیخ علی داؤد، شاہ شیخو مجذوب، حضرت حمزہ چشتی وغیرہ جیسے مشائخ کبار آفتاب و ماہتاب کی طرح چمکے اور اپنے نور باطن سے لوگوں کے تاریک دلوں کو روشن کیا۔ وہیں ملک العلما قاضی شہاب الدین مصنف ''ارشاد'' استاذ العلماء قطب وقت شیخ افضل جونپوری، دیوان محمد رشید جونپوری صاحب ''رشیدیہ''، مولانا الہ داد ''شارح ہدایہ'' مولانا محمد جمیل (فتاوی عالمگیری کے رکن) جیسے علماء نے جونپور کو جملہ اسلامی علوم وفنون میں مرکزیت عطا کی اور زمانہ اسے ''شیراز ہند'' کے نام سے یاد کرنے لگا۔

نام ونسب اور تعلیم وتربیت:

آپ کا نام محمود ہے۔ والد کا نام محمد اور دادا کا نام بھی محمد ہے۔ آپ نسباً فاروقی ہیں۔ وطن عزیز جونپور ہے۔ یہیں ۹۹۳ھ میں آپ کی ولادت ہوئی اور جدامجد شاہ محمد کی گود میں پرورش پائی۔ گیارہویں صدی کے علما مشرق میں ملا محمود جونپوری عبقریت کے اعلی مقام پر نظر آتے ہیں۔ بالخصوص حکمت وفلسفہ میں کامل دستگاہ اور خاص مہارت رکھتے تھے۔ ابتدائی کتابیں دادا سے پڑھیں اس کے بعد استاذ العلما شیخ محمد افضل جونپوری سے استفادہ کیا۔ سترہ سال کی عمر میں تحصیل علوم سے فارغ ہوئے۔ تذکرہ مشائخ رشیدیہ میں خوشتر نورانی لکھتے ہیں۔:

''ملا محمود جونپوری بن شیخ محمد بن شاہ محمد فاروق دیگر علوم کے ساتھ حکمت وفلسفہ میں بلند مقام رکھتے تھے۔ شیراز ہند جونپور کو جن علما کی وجہ سے فخر حاصل ہے، ان میں ایک نام ملا محمود کا بھی ہے۔ آپ کی ولادت جونپور میں ۹۹۳ھ میں ہوئی۔ اپنے دادا شیخ محمد کی گود میں پرورش پائی اور ان ہی سے ابتدائی کتابوں کو پڑھا، اس کے بعد استاذ العلما شیخ محمد افضل جونپوری کی خدمت میں رہ کر فائق القران ہوئے۔ سترہ سال کی عمر میں تعلیم سے فراغت پائی۔'' (ص/۲۵۶)

علامہ عبدالحی الحسنی الندوی اپنی کتاب نزہۃ الخواطر میں ملامحمود جونپوری کی ولادت، تعلیم وتربیت کے متعلق لکھتے ہیں۔:

''الشیخ الامام العالم الکبیر العلامۃ الشہیر محمود بن محمد العمری الجونپوری، احد الفاضل المشہورین، لم یکن فی زمانہ مثلہ فی العلوم الحکمیۃ والمعارف الادبیہ، ولد بجونپور سنۃ ثلاث وستین وتسعمائۃ، ونشأ فی مہد جدہ شاہ محمد وقرأ علیہ الکتب الدرسیۃ، ثم لازم الشیخ الاستاذ محمد افضل بن محمد حمزۃ العثمانی الجونپوری وأخذ عنہ، واقبل علی المنطق والحکمۃ اقبالا کلیاً حتی برز فی تلک الفضائل وبرع اقرانہ ولہ سبع عشرۃ سنۃ۔'' (جلد۵،ص۴۲۹)

علمی مقام:

آپ بلا کے ذہین تھے، قوت حافظہ بھی خوب پایا تھا۔ اپنی نوجوانی میں جب کبار علما کی مجلسوں میں علمی نکات بیان کرتے تو علما حیران رہ جاتے تھے۔

استاذ العلما شیخ محمد افضل جونپوری کو آپ کے علم پر بہت فخر تھا۔ مآثر الکرام میں آزاد بلگرامی لکھتے ہیں۔

''شیخ محمد افضل استاد علامہ فرمود از وفتے کہ علامہ تفتازانی وجرجانی از عالم رفتہ اند کسے اجتماع دو فاضل بہ این فضیلت در یک شہر نشان نہ دادہ۔ یعنی ملامحمود وشیخ عبدالرشید [دیوان محمد رشید] کہ ذکرش می آید۔'' (ص۲۰۳)

تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ آپ سے تاعمر ایسا کوئی قول صادر نہیں ہوا جس سے آپ کو رجوع کرنے کی ضرورت پڑی ہو۔ نزہۃ الخواطر میں ''سبحۃ المرجان'' کے حوالہ سے علامہ عبا الحی الحسنی لکھتے ہیں۔:

''قال سید غلام علی بن محمد نوح الحسنی البلگرامی فی ''سبحۃ المرجان'' انہ ما صدر عن العلامۃ فی طول العمر قول یرجع عنہ، و کان اذا سأل سائل عن مسألۃ وکان فکرہ حاضراً اجاب ولا۔''

آپ جونپور میں رصدگاہ بنانا چاہتے تھے۔ جس کے لیے شاہی امداد کی خاطر آپ اکبرآباد [آگرہ] گئے، مگر بادشاہ ہند شاہجہاں نے اپنے وزیر آصف خان کے ذریعے منع کروادیا۔

''صاحب قرآن ثانی شاہجہان را بہ رصد بستن راغب ساخت۔ وزیر از بعضے وجوہ رائے بادشاہ را برگردانید وگفت مہم بلخ درپیش است۔'' (مآثر الکرام،ص۲۰۳)

نزہۃ الخواطر میں ہے کہ:

''وکان ارادان یبنی مرصداً فذہب الی اکبرآباد لیحرص السلطان علی ذلک، فما وافقہ الوزیر فمنع السلطان عنہ وقال ان مہمات ''بلخ''، تقتضی مالا خطیراً وان المرصد الذی بناہ الغ بیگ یغنی عنہ'' (ج۵،ص۴۳۰)

وہ شاگرد کتنے عظیم المرتبت ہوتے ہیں جن کا نام لے کر انکے استاذ کی تعریف کی جائے۔ ابوالعرفان الندوی اپنے مقالہ ''معقولات کے میدان میں ہندوستانی مسلمانوں کی خدمات'' میں رقمطراز ہیں:

''پورب میں فلسفہ ومعقولات کی اشاعت کا ایک دوسرا سلسلہ علماء جونپور کا ہے۔ ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے زمانہ میں فلسفہ ومعقولات کا رواج نہیں تھا لیکن ایک سو سال کے اندر ہی ہندوستان کے نظام درس میں فلسفہ ومعقولات کا رواج ہوگیا۔ مولانا الہ داد جونپوری نے ملا عبداللہ تلنبی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ملا الہ داد جونپوری نے ملا عبداللہ تلنبی سے تعلیم حاصل کر کے جونپور میں اپنی درسگاہ قایم فرمائی، اور فلسفہ ومعقولات کی گرم بازاری ہوئی۔ ان کے بعد استاذ الملک ملا افضل جونپوری کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے، ان کی علمی جلالت وشان اور عظمت کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یہ ملامحمود جونپوری صاحب شمس

بازغہ اور فرائد اور دیوان محمد رشید جونپوری صاحب رشیدیہ کے استاذ ہیں، ملا محمود جونپوری کو فلسفہ ومعقولات میں جو شہرت وعظمت حاصل ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اسی طرح دیوان محمد رشید کی علمی منزلت کے لیے کسی ثبوت اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔'' (ہندوستان میں اسلامی علوم وادبیات، ص ۷۳/)

شیخ محمد افضل جونپوری کی درسگاہ میں ملا محمود اور دیوان محمد رشید جونپوری اکثر ہم سبق رہا کرتے تھے۔

جب آپ رصد خانہ کی تعمیر سے ناامید ہوگئے تو جونپور واپس آگئے اور درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد شاہ شجاع نے آپکو بنگال بلالیا اور حکمت کی تعلیم حاصل کی۔

''ثم استقدمہ شجاع ابن شاہجہان الی بنگالہ فسار الیہ، وقرأ علیہ الشجاع کتباً فی العلوم الحکمۃ'' (نزہۃ الخواطر، ج/۵، ص/ ۴۳۰)

شاہ شجاع کے علاوہ نواب شائستہ خان، شیخ نورالدین جعفر الجونپوری، عبدالباقی بن غوث الاسلام الصدیقی وغیرہ جیسے جید علما نے آپ سے استفادہ کیا۔ عبدالحی الحسنی لکھتے لکھتے ہیں۔:

''وقرأ علیہ نواب شائستہ خان ابوطالب بن ابی الحسن الاکبرآبادی ''فرائد المحمودیۃ'' والشیخ نورالدین جعفر جونپوری وعبد الباقی بن غوث الاسلام الصدیقی صاحب ''الآداب الباقیۃ'' وخلق کثیر من العماء۔'' (نزہۃ الخواطر، ج/۵، ص/۴۳۰)

تصنیف وتالیف:

ملا محمود بہت ساری اہم کتابوب کے مصنف ہیں۔ ان میں شمش بازغہ، فرائد محمودیہ بہت مشہور اور اپنے فن میں نہایت جامع ہیں۔ ایک عرصہ تک یہ دونو کتابیں مدارس اسلامیہ کے نصاب میں داخل رہی ہیں۔

تذکرہ مشایخ رشیدیہ میں خوشتر نورانی لکھتے ہیں۔

علم حکمت میں آپ کی مشہور زمانہ کتاب ''شمس بازغہ'' ہے، آج بھی مدارس اسلامیہ میں جس کی تدریس وتحصیل اساتذہ وطلبہ کے لیے باعث افتخار ہے۔ اس کے علاوہ علم معانی وبیان مین ''فرائد فی شرح فوائد مع حاشیہ''، حرز الایمان اور شعری دیوان (فارسی) آپ کی یادگار ہے۔ (ص/۲۵۶)

ظفر المحصلین فی احوال المصنفین میں ہے۔

''معانی وبیان میں ''الفرائد شرح الفوائد'' اقسام نسواں میں چہار ورقی ''رسالہ کتاب التسویہ'' کے رد میں ''حرز الایمان''، شعروشاعری میں ایک ''دیوان''، فن حکمت میں ''الحکمۃ البالغۃ'' اور اس کی شرح ''شمس بازغہ'' جس کے بارے مین علما کا اتفاق ہے کہ اس کے برابر آج تک علم حکمت میں کوئی تصنیف نہیں ہوئی۔'' (ص/۲۸۸)

نزہۃ الخواطر میں ہے کہ:

''وللشیخ محمود الجونپوری مصنفات عدیدۃ، اشہرھا الشمس البازغہ فی الحکمۃ، والفرائد(۱) شرح الفرائد للقاضی عضدالدین الایجی فی المعانی والبیان ولہ تعلیقات نفیسۃ علی ذلک الشرح، ولہ ''حرز الایمان'' فی الرد علی التسویۃ للشیخ محبّ اللہ الالہ آبادی، ولہ رسالۃ بالفارسیۃ فی اقسام النساء، ولہ دیوان شعر فارسی۔'' (ج/۵، ص/۴۳۱)

عرفان وسلوک:

جب آپ شہزادہ شجاع کو علم وحکمت کی تعلیم دینے کے لیے بنگال گئے تھے تو وہاں شیخ نعمت اللہ بن شیخ عطاء اللہ فیروز پوری سے ملاقات ہوئی۔ شیخ کی طرف دل مائل ہوا۔ آپ ان سے بیعت ہوئے اور ان سے علم طریقت حاصل کیا۔

نزہۃ الخواطر میں اس کی تفصیل موجود ہے،

''وادرک محمود نعمۃ اللہ بن عطاء اللہ الفیر وزپوری بارض بنگالہ فبایعہ واخذ عنہ الطریقۃ ستۃ اثنین وخمسین والف، وانی رایت رسالۃ لہ فی الاذکار التی اخذھا عن الشیخ المذکور۔'' (ج ۵/ص ۴۳۰)

وفات:

ملا محمود جونپوری کا انتقال ربیع الاول کی ۹/تاریخ کو ۱۰۶۲ھ کو جونپور میں ہوا، اور وہیں مدفون ہوئے۔

صاحب نزہۃ الخواطر رقمطراز ہیں:

''توفی لتسع خلون من ربیع الاول ستۃ اثنتین وستین والف بمدینۃ جونپور، وقبرہ مشہور ظاہر خارج البلدۃ۔'' (نزہۃ الخواطر، گ/۵، ص ۴۳۱)

''۱۰۶۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ مزار چاچک پور، شہر جونپور میں ہے۔'' (مقالات حبیب، ج/۳، ص/۲۸۱)

''۹/ربیع الاول ۱۰۶۲ھ [۱۹/فروری ۱۶۵۲ء] میں ملا محمود کی وفات ہوئی۔ اس کے چالیس دن کے بعد آپ کے استاذ شیخ محمد افضل جونپوری نے بھی اس صدمہ کی تاب نہ لاکر انتقال فرمایا۔'' (تذکرہ مشائخ رشیدیہ، ص ۲۵۷)

مراجع:

نزہۃ الخواطر، جلد/۵، عبدالحی الحسنی۔ دارالعرفات، رائے بریلی، ۱۹۹۲ء
تزکرہ مشائخ رشیدیہ، خوشتر نورانی۔ شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء
مقالات حبیب، جلد/۳۔ حبیب الرحمٰن الاعظمی۔ شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند، ۲۰۰۹ء
مآثر الکرام، غلام علی آزاد بلگرامی۔ مفید عام، آگرہ۔ ۱۹۱۰ء
ظفر المحصلین فی احوال المصنفین، محمد حنیف گنگوہی، دارالاشاعت، کراچی۔ ۲۰۰۰ء
سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، غلام علی آزاد بلگرامی، تقدیم وتحقیق، محمد سعید الطریحی۔ دارالرافدین، بیروت، ۲۰۱۵ء
ہندوستان میں اسلامی علوم وادبیات، عماد الحسن آزاد فاروقی، منتبہ جامعہ لیمیٹیڈ، نئی دہلی۔ ۱۹۸۶ء

☆☆☆

افتخار علی جعفری
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

شیخ یعقوب صرفی کی فارسی نعت، قصائد و منقبت پر ایک اجمالی نظر

چکیدہ: شیخ یعقوب صرفی کشمیری وہ مایہ ناز شخصیت ہے کہ جس طرح ہندوستان میں، کشمیر کو خوبصورتی میں ایک اہم مقام حاصل ہے بعینہ صرفی کو شعرای کشمیر میں ایک وہی مقام حاصل ہے۔ صرفی ادب کا وہ گھوارہ اور گلدستہ ہیں کہ جو مغلیہ سلطنت کے آواخر یعنی اکبر بادشاہ کہ زمانے میں شامل حال رہے ہیں موصوف منظوم کلام میں صاحب دیوان کے ساتھ ساتھ پانچ مثنویوں کہ جو نظامی اور جامی کی پیروی میں لکھی ہیں اور قریب دو سو رباعیات کے مالک ہیں جبکہ انہوں نے نثر میں بھی ایک بہترین مقام حاصل کیا ہے۔ تواریخ گواہی دیتی ہیں کہ مولانا دنیا کی محبت اور دنیاوی عیش عشرت سے بہت دور تھے اوبچپن سے قرب خدا حاصل کرنے کیلیے دینی کتب کے مطالعہ میں مصروف رہے ہیں اور ہمیشہ حمد ثنای پروردگار، نعت و توصیف پیمبر اکرم ﷺ اور منقبت اولیاء کرام کو اپنا فریضہ سمجھا ہے خواہ انکا منظوم کلام ہو یا منثور پند و نصائح سے لبریز نظر آتا ہے اور کبھی بھی باشاہوں اور وزیروں کی مدح نہی کی ہے اور نہ ہی کبھی انعام و اکرام کی لالچ کی تھی بلکہ ہمیشہ اپنا دامن ان چیزون سے دور رکھا تھا پھر بھی بادشاہ اور وزراء انکی بہت تعظیم و تکریم کیا کرتے تھے۔

کلیدی الفاظ: شیخ یعقوب صرفی، نعت، قصائد و منقبت

ای آنکہ تو ھم طالب و ھم مطلوبی ھم یوسف و ھم عزیز و ھم یعقوب
محبوب ہمہ جہان توئی از خوبی وین طرفہ کہ ھم محبّ و ھم محبوبی (۱)

شیخ یعقوب صرفی کشمیری کی فارسی نعت، قصائد اور منقبت پر مختصر طور پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شیخ یعقوب صرفی کشمیری، کشمیر کا ایک درخشاں ستارہ، سر برآوردہ فنکار، مفکر، مودب جامع الصفات، جامع الکمالات نے ۹۲۸ھ مطابق ۱۵۲۱ عیسوی میں اس دنیا میں قدم رکھا ہے۔ اس عظیم صوفی بزرگ کا شمار کشمیر کے چیدہ اور برگزیدہ شعراءؔ اور ادباء میں کیا جاتا ہے۔ انہیں شعر و شاعری اور ادب سے ہٹ کر دین سے بے انتہا محبت تھی اسی لیے انکو مذہبی اور روحانی ہستیوں میں ایک اعلیٰ مقام حاصل تھے۔ آپ خاندان عاصمی کے چشم و چراغ اور کشمیر کی باوقار اور برجستہ شخصیتوں مین سے ایک تھے اور خاندانی لحاظ سے عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کے فرزند عاصم کی اولاد سے ہیں اسی نسبت سے آپ عاصمی کہلاتے ہیں۔ آپکے والد محترم کا نام میر حسن گنائی ابن میر علی بن میر بایزید تھا (۲)۔ گنائی عالم و فاضل شخص کو کہتے ہیں چوں کہ اپکا خاندان علم و فضل کے لحاظ سے ہمیشہ ممتاز رہا ہیا سی لیے آپ گنائی کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔ آپ نے ۵۷ سال کی عمر پا کر ۱۰۰۳ھ مطابق ۱۵۹۳ عیسوی میں اس جہان فانی کو الوداع کر دیا۔ جامع الکمالات حضرت شیخ یعقوب صرفی کی تصانیف کی تعداد معین نہی ہو سکی بہر حال کچھ

مشہور تصانیف قابل ذکر ہیں (۱) تفسیر قرآن مجید، جو مکمل نہی ہوسکی بلکہ صرف قرآن کے دو پاروں کی تفسیر ملتی ہے (۲) تقریظ کتاب سواطع الالہام مصنف فیضی (۳) پنج گنج، جس میں مسلک الاخیار، وامق عذرا، مغازی النبی اور مقامات مرشد شامل ہیں۔ یہ پانچ کتابیں خمسہ جامی ونظامی کی پیروی میں لکھی گئی ہیں (۴) مناسک حج (۵) شرح صحیح بخاری (۶) حاشیہ کتاب توضیح وتلویح (۷) کنز الجواہر (۸) رسالہ اذکار۔ اسکے علاوہ اپ کا دیوان کہ جو قصائد، نعت، مناقب اور رباعیات پر مشتمل موجود ہے۔

صرفی وہ متین، سنجیدہ اور بزرگ ہستی تھی کے جنکو علوم وفنون پر بہترین مہارت حاصل تھی جو خود انکے آثار وتالیفات میں نمایاں ہوتی ہے۔ آپ ۷ سال کی عمر میں حافظ قرآن ہو گیے اور ۸ سال کی عمر میں انہوں نے فارسی میں شعر کہنا شروع کیے چنانچہ مغازی النبی میں خود فرماتے ہیں کہ:

چودرسال ہشتم نہادم قدم　　زطبعم روان گشت شعر عجم (۳)

اوائل میں انکے والد بزرگوار جو کے ایک بلند پایہ فاضل تھے آپکے اشعار کی اصلاح کرتے تھے جیسا کے آپ نے خود فرمایا ہے:

پدر کردے اصلاح اشعار من　　دراین کار بودہ مددگار من (۴)

صرفی نے بہت سارے اساتذہ کو جو اس وقت کے مشہور ومعروف ادیب تھے تحصیل علوم کیا ان میں خصوصا ملا آنی کا اسم گرامی جو مولانا عبدالرحمٰن جامی کے شاگرد تھے قابل ذکر ہے (۵)۔

ملا آنی نے حضرت صرفی کے غیر معمولی فہم وادراک اور فصاحت وبلاغت کا جائزہ لے کر اس بات کی پیشن گوئی کی تھی کے صرفی ایک دن مولانا جامی کا رتبہ حاصل کر کے جامی ثانی لقب سے مشہور ہو جائیں گے اور پیشن گوئی بھی بلکل درست ثابت ہوئی کیوں کہ صرفی کو جامی ثانی بھی کہا جاتا ہے (۶)۔ چنانچہ آپ نے خود بھی اپنے اشعار میں اس طرف اشارہ کیا ھے:

بعد خسرو بود جامی بلبل باغ سخن　　کیست جز صرفی کنون آن مرغ خوش خواں راعوض (۷)

گویا اپکا انداز سخن آپکی رفتار وچال چلن بلکل صوفیانہ تھی شاید اسی لیے اپکو صوفی شاعر بھی کہا جاتا ھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی جو حضرت صرفی کے ہمعصر تھے وہ صرفی کو اس زمانے کی ممتاز ترین ہستی تصور کرتے تھے ملا بدایونی نے لکھا ھے کے حضرت صرفی تمام علوم تفسیر قرآن و حدیث اور تصوف میں مہارت رکھتے تھے۔ بدایونی کا کہنا ہے کے ہمایوں اور اکبر دونوں کو صرفی سے بڑی عقیدت تھی اور انکی بہت تعظیم وتکریم کیا کرتے تھے۔

آپکی تصانیف میں رسالہ اذکار کے مطالع سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ معرفت الٰہی کا ایک سرچشمہ تھے اگر چہ آپ دنیا کی آوارگیوں سے بہت دور رہتے تھے اور فقر کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے اسی لیے سلاطین وقت آپکا بے حد احترام کیا کرتے تھے۔

مولانا شیخ یعقوب صرفی نے نعت گوئی میں کافی مہارت حاصل کی ہے اور بہت ساری نعتیں رسول خدا کی شان میں کہی ہیں انہون نے چاہے کسی بھی صنف سخن میں کام کیا ہو لیکن انکا کوئی بھی کلام خصوصا مثنویوں کی ابتدا ذات خدا کی حمد وثنا کے بعد سرور کائنات کی شان

میں نعتیں لکھی ہیں جیسا کہ مسلک الاخیار میں معبود کریم کی ستائش کرتے ہیں:

ای بصفات ازلی متصف　　خلق بخلاقی تو معرف

زندہ تو بودی و نبودہ کس　　کس نبود زندہ توباشی و بس

ما بتو اما توخود بخود زندہ زندہ کن و زندہ پایندہ

انکی شاعری کو پڑھ کرایسا لگتا ہے کہ یہ اعلٰی درجہ کے موحد اور توحید پرست تھے اور خدا سے ایسے ہمکلام ہوتے تھے کہ اپنی روح سے نھی بلکہ اپنی ظاہری آنکھوں سے ذات اقدس کا مشاہدہ کررہے ہیں۔

مغازی النبی کی ابتدا میں ہی میں ذات ربوبی کی مدح وثنا کرتے ہیں اور اسی طرح اپنی تمام مثنویوں میں بلکہ ہر کلام کو ذات خدا کی ستائیش کرتے ہوے آغاز کیا ہے:

خدایا خدائی مسلم تراست خداوندئی ہر دو عالم است

توئی آفرینندہ کائنات تو قیوم وکونین وقائم بذات

مدح وستائش خدا کے بعد سرکار دوعالم کی شان میں ایسا کلام لکھا ہے جیسے کوئی خاص مطیع وفرمابردار اپنے اقا و مولا کی تعریف کرتا ہے لکھتے ہیں:

رسول خدا مقتدای انام علیہ الصلوۃ علیہ السلام

شہ انبیا خاتم المرسلین باوافتخار زمان وزمین (۸)

اور ایک دوسری نعت میں لکھتے ہیں کہ:

دلم افگار یا رسول اللہ بہر دیدار یا رسول اللہ

روی من ازگناہ گشتہ سیاہ پردہ بردار یا رسول اللہ (۹)

مولانا شیخ یعقوب نے دیگر اصناف سخن کی طرح فن قصیدہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس فن میں بعض ایرانی گوشعرا کے مثل دکھای دیتے ہیں۔اکثر شعرا انعام واکرام کی لالچ میں فن قصیدہ میں طبع آزمائی کرتے تھے لیکن مولانا شیخ یعقوب نے اپنی ایک الگ راہ متعین کی ہے۔انہوں نے دنیوی اغراض ومقاصد کو سامنے رکھ کر قصیدہ کا سہارہ نہی لیا بلکہ انکے دل میں جو عقیدت و ارادت اور احترام جو حضور پاک ﷺ و اولیا و اصفیا کے تئیں تھا اس سے انکے قصیدہ کو ایک منفرد حیثیت حاصل ہوئی۔ باوجود اسکے مولانا صرفی بادشاہوں اور وزیروں کے زمانے میں زندگی گزار رہے تھے کبھی بھی انہوں نے درباروں میں جا کر قصیدہ سرائی نہی کی اور ہمیشہ اپنے دامن کو بادشاہوں کی تعریف وتوصیف سے بچاے رکھا بلکہ انہوں نے اپنے قصائد کو حمد باری تعالٰی،نعت رسول مقبول،خلفای راشدین کی منقبت اہل بیت رسول کی مدح وتوصیف اودیگر اولیا کرام کے لے وقف کیا ہے انہوں نے بیشتر مدحیہ قصائد کی ابتدا میں اللہ تعالٰی کی ذات وصفات کا بیان نہایت اعلٰی طریقہ سے کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی عاجزی اور بےبسی کا اظہار کیا ہے۔اپنے ایک قصیدہ میں لکھتے ہیں:

بجانم بندہ اصحاب وآلت یا نبی اللہ کہ ہست این بندگی فخرم چہ در دنیا چہ در عقبیٰ

چہ آلے چہ اصحابی عظیم الشان تعالٰی اللہ کہ جز در حب ایشان نیست لیکن دولت عقبٰی

امیر المومنین حیدر علیؑ ابن ابی طالب کہ ہست اہل ولایت را امام و سید ومولٰی

چہ گویم وصف عمین تو یعنی حمزہ وعباس کہ آمد در معارف ہر یکی مانند صد دریا

حسنؑ آن آفتاب آسمان عزت ورفعت حسینؑ آن صحن صحرائے صفا را لالہ حمراء

موصوف نے نعت اور قصیدہ کے ساتھ ساتھ اولیاء،اصفیاء خلفاء راشدین،اصحاب پیمبر اور بارہ اماموں کی شان میں بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ منقبت سرائی کی ھے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اپنے ولیوں اور پیروں اور

مرشدوں سے بے حد محبت تھی۔اس صنف سخن میں بھی صرفی کو خاصی مہارت حاصل تھی اور متعدد تعداد میں انہوں نے مناقب لکھی ہیں۔

چنانچہ اپنی ایک منقبت میں شاہ ہمدان کی مدح سرائی کرتے ہوے لکھتے ہیں کہ:

سید و صدر اولیاے خدا علی ثانی آن امام ھدیٰ
قرۃ العین سرور عالم ولدمعنوی وصوری ہم
فخر آل محمد عربی مشعل دودمان مطلبی
وارث معنی نبی و علی معنی از صورتش تمام جلی (۱۰)

حضرت فاطمہ زہرہ سیدۃ النساعالمین کی منقبت سرائی کرتے ہوے لکھتے ہیں:

ای سیدہ نساء جنت وی بضعتہ خاتم نبوت
ای نور دو دیدہ محمد وی راحت جان پاک محمد
موزی تو موزی رسول است مردود خدا و نا قبول است
فرمود ﷺ کہ بودہ است زہرا محبوب ترین خلق او را (۱۱)

گویا مولانا شیخ یعقوب صرفی نے ہر ایک صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر ایک فن میں ماہ تابندہ کی طرح درخشاں نظر اتے ہیں اور کہیں بھی انکا کلام عشق خدا،عشق رسول وآل رسول سے ہٹ کر نظر نہیں اتا ہے۔انکا کلام چاہے نظم کی شکل میں ہو چاہے نثر کی شکل میں ہو فصاحت و بلاغت سے لبریز اور پند ونصائح سے بھرپور نظر اتا ہے۔

حواشی وحوالاجات:

۱۔ دیوان صرفی (رباعیات ومتفرقات) نسخہ خطی (ص) ۲۸۷۔
۲۔ محبّ الحسن کشمیر سلاطین کے عہد میں (ص) ۱۲۰۔
۳۔مغازی النبی نسخہ خطی (ص) ۵۔
۴۔ھمان
۵۔اعظم کشمیری،خواجہ محمد اعظم دیدیمری: واقعات کشمیر، کتابفروشی غلام محمد نور محمد (ص) ۸۵
۶۔ھمان (ص) ۲۵
۷۔دیوان صرفی باہتمام میر حبیب اللہ کاملی متولی سجادہ نشین بقاع عالیہ اکملیہ بروکاز پریس سرینگر در ماہ ذی الحجہ ۱۳۱۸ھ طبع شد (ص) ۵
۸۔مغازی النبی نسخہ خطی (ص) ۸
۹۔نالہای آتشین سال اشاعت ۱۴۳۲ھ مطابق ۲۰۱۱ء (ص) ۴۱۵
۱۰۔ھمان (ص) ۶۳۴
۱۱۔ھمان (ص) ۵۵۱

☆☆☆

سید تصور مہدی
ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

رتن سنگھ، ایک ادبی شخصیت

چکیدہ: تذکرہ کی کتابوں میں اودھ کے شعراء، ادباء، علماء اور صوفیائے کرام کا تذکرہ اس کثرت سے ملتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ مصنفین اور تذکرہ نگاروں نے لکھنوی تہذیب سے مرصع و مشہور اودھ کے شعراء کو اپنے تذکروں میں قابل ذکر جگہ سے نوازا ہے۔ فارسی اور اردو گو شعراء نے ادب کے چراغ کو اودھ میں اس طرح روشن کیا کہ دہلی کی روشنی بھی مدھم پڑنے لگی، بالخصوص شعر گوئی نے اپنا ایک مخصوص انداز پیدا کیا اور ایک نئے شعری دبستان کی بنیاد پڑی۔ اسی دبستان کو آج دبستان لکھنؤ کے نام سے جانا جاتا ہے شعراء، ادباء، نثر نگار کی طویل فہرست اس دبستان سے منسلک رہی اسی میں ایک نمایاں اور ممتاز نام راجہ رتن سنگھ زخمی کا بھی ہے۔

کلیدی الفاظ: رتن سنگھ، شاعری، تصنیفات، اودھ

نوابین اودھ کا دور فارسی و اردو کے شعراء و شاعری کو بہت راس آیا جس میں اٹھارویں صدی یعنی سعادت خان برھان الملک سے شروع ہو کر انیسویں صدی کے وسط، نواب واجد علی شاہ کے عہد تک کئی معروف اردو اور فارسی شعراء گزرے ہیں جنکے ذکر سے اس دور کے اکثر تذکرہ نگاروں کے تذکرے خالی نظر آتے ہیں لیکن بعض قابل ذکر شعراء ایسے بھی گزرے ہیں جنکا ذکر اکثر تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں کیا ہے۔ انھیں میں سے ایک نام رتن سنگھ زخمی کا بھی ہے۔

راجا رتن سنگھ کا تعلق کائست قبیلہ سے تھا، انکے اجداد بریلی کے تھے لیکن رتن سنگھ کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ زخمی کے والد کا نام راجا بک رام تھا جو خود بھی شاعر تھے اور صبوری تخلص کرتے تھے اور مہاراجا بھاؤ مل کے نائب تھے۔(۱)

زخمی کی ولادت ۲۳ محرم ۱۱۹۷ھ کو لکھنؤ میں ہوئی۔ انھوں نے انگریزی، عربی، ہندی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ گھر میں شاعرانہ ماحول ہونے کی وجہ سے زخمی کو بچپن سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا، شاعری میں انھیں میرزا محمد حسین قتیل سے شرف تلمذ حاصل تھا اور انھیں سے اپنے اشعار پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ اگر حکومت میں مشاورت کی بات کی جائے تو اس میں بھی زخمی نوابین اودھ کے کہیں اتالیق کہیں دربان اور کہیں منشی نظر آتے ہیں، ابتداء میں بادشاہ نصیر الدین حیدر کے اتالیق رہے پھر انھیں کے دربار کے دربان بنے اور بالآخر منشی جیسے معتبر عہدے پر فائز ہوئے۔ بادشاہ نے انھیں منشی الملوک، فخر الدولہ اور دبیر الملک جیسے خطابات سے نوازا۔ بادشاہ محمد علی شاہ کے عہد میں منشی کے کام کے علاوہ حکومت کے دیوانی معاملات میں بھی انکی رائے لی جانے لگی لیکن (ہر کمال را زوال) کے مصداق امجد علی شاہ کے زمانے میں ان تمام عہدوں سے سبکدوش کر دیا گیا۔(۲) اس طرح رتن سنگھ نے اپنی زندگی میں بادشاہ نصیر الدین حیدر، مرزا فریدون بخش، محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ جیسے چار نوابوں کا دور بہت قریب سے دیکھا۔

اگر چہ زخمی ایک ہندوستانی شاعر تھے لیکن انکی فارسی شاعری ،ایران کے مشاق شاعروں جیسی معلوم ہوتی ہے۔فارسی کے عمیق سمندر میں کس حد تک غوطہ زن تھے اسکا اندازہ انکے اشعار سے لگایا جاسکتا ہے اور اس بات کا واضح ثبوت انکا فارسی دیوان ہے جس میں شاعری کے مختلف اصناف جیسے غزل،مخمس،منقبتی قصیدے اور رباعی پر طبع آزمائی کی گئی ہے حیرت کی بات یہ ہے کہ نوابوں سے نہایت قربت کے باوجود ایک قصیدہ بھی کسی نواب کی مدح میں دیوان میں نہیں ملتا جبکہ رسول اکرم اور انکے اہل بیت کی شان میں کئی قصیدے موجود ہیں۔وہ حافظ کی طرح غزل کے شاعر ہیں ،انکی غزلوں میں سعدی،خسرو،فیضی،نظیری اور عرفی جیسی روایتیں نظر آتی ہیں۔ردیف وقافیہ کا انتخاب،الفاظ کی نشست و برخاست اور مضمون آفرینی فارسی کے کلاسکی شعراء کی یاد تازہ کرتی ہے۔وہ اپنی ایک غزل میں اس طرح گویا ہوتے ہیں:۔

ازنظر چون فکند یار مرا　　زد سرِ خاک روزگار مرا
من وبی یار زندگی ای وای　　نیست بر مردن اختیار مرا
من و عشق تو ھر چہ خواھی کن　　جز تو با دیگری چہ کار مرا (۳)

مندرجہ بالا اشعار زخمی کے مہارت ادبی کا پتہ دینے کے لئے کافی ہیں۔

زخمی کے دیوان کا آخری حصہ رباعیات پر مشتمل ہے جس کی پہلی رباعی میں اک کرب نظر آتا ہے شاید یہ رباعی اس زمانہ میں لکھی گئی ہوگی جب انھیں تمام عہدوں سے سبکدوش کر دیا گیا تھا اور وہ مشکلات زندگی سے ہمکنار تھے،رباعی کے مضمون سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اس دور میں تنگدستی کی بنا پر کسی مونس و مددگار کی تلاش میں تھے،فرماتے ہیں:۔

درماندہ ام و ھم نفسی نیست مرا　　می نالم و فریاد رسی نیست مرا
یارب بنظر بحال زارم از رحم　　جزمسلم و جزتوکسی نیست مرا(۴)

رتن سنگھ زخمی کے علمی آثار:۔

۱۔**دیوان زخمی:**۔اگر چہ زخمی کا بیشتر وقت حکومتی معاملات میں گذرتا،ان مصروفیات کے باوجود انھوں نے کئی علمی اور ادبی سرمایہ ہمارے درمیان چھوڑا جن میں سے ایک انکا فارسی دیوان ہے جو کہ ۱۲۵۳ھ میں مطبع محمدی لکھنو سے چھپ کر منظر عام پر آیا۔دیوان کے دو نسخے خدا بخش اورینٹل لائبریری،پٹنہ میں موجود ہیں،دوسرے نسخے کے سرورق پر رتن سنگھ کی دیدہ زیب تصویر بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔یہ دیوان ۵۱۳ صفحوں پر مشتمل ہے جس میں شاعری کی تقریباً تمام اصناف پر طبع آزمائی کی گئی ہے،البتہ دیوان کا اکثر حصہ غزلوں پر مبنی ہے یعنی ازصفحہ اول تا صفحہ ۴۷۸،غزل کے بعد قصائد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور یہ سلسلہ صفحہ ۴۸۴ تک جاری رہتا ہے،پھر مخمس،مسدس اور آخر میں ۳۶ رباعیات ہیں۔

۲۔**شرح گل کشتی:**۔میر ابوالعال نجات کی مثنوی **گل کشتی**،جس میں کشتی کے فنون و رموز سے بحث کی گئی ہے،چونکہ مثنوی کے اشعار بہت ہی دقیق تھے لہذا رتن سنگھ نے مناسب سمجھا کہ اس مثنوی کی شرح لکھ دی جائے،چنانچہ کتاب کی ابتداء میں خود فرماتے ہیں: ''در پی حل مشکلات ھمچو کتاب لاینحل یعنی مثنوی میر ابوالعال نجات کہ موسوم بگل کشتی است افتادہ ام،و با انچنین پزبانی درمیان غوامض نکات این کتاب دقیق کہ مزلۃ الاقدام نکتہ سنجان ھر دیار است،لب کشادہ ام عجب نیست کہ لغزشی بکار رود یا خطائی واقع شود۔(۵)''

شرح گل کشتی کا قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری،علیگڑھ مسلم یونیورسٹی،اور خدا بخش اورینٹل لائبریری،پٹنہ میں موجود ہے۔ ۱۹۸ صفحہ پر مشتمل یہ شرح لچھمی نراین کے قلم سے لکھی گئی ہے جس کی تصدیق آخر کی یہ عبارت کرتی ہے۔۔''بفضلہٖ تعالی شرح گل

کشتی میرابوالعال نجات بخط خام اضعف العباد لچھمی نرائن فی التاریخ نوزدھم رجب المرجب ۱۲۳۲ باتمام رسید۔(۶)

۳۔حدائق النجوم:۔ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کی فرمائش پر ۱۲۵۳ھ میں لکھی۔اس کے چھپن (۵۶) اجزاء ہیں۔حدائق النجوم کا شمار نجوم کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے،اس کتاب میں انگریزی کتب سے بھی فیض اٹھایا گیا ہے (۷)۔قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری، علیگڑھ مسلم یونیورسیٹی علیگڑھ میں موجود ہے۔

۴۔انیس العاشقین:۔ قلمی نسخہ ٹیگور لائبریری لکھنو میں موجود ہے جو کہ ۱۸۲۹ء میں لکھا گیا۔

۵۔سلطان التواریخ:۔ ۱۲۵۸ھ تک کے شاہان اودھ کے حالات پر مشتمل یہ کتاب بہت ہی اہم معلومات فراہم کرتی ہے اس کتاب کا بھی قلمی نسخہ ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی میں موجود ہے جو کہ ۱۲۵۸ھ میں سپرد قلم کیا گیا۔

احسن التواریخ صفحہ ۱۲۹،اور انیس العاشقیں صفحہ ۱۳۰ کے مطابق رتن سنگھ زخمی نے اسلام قبول کرلیا تھا جس کی نشاندہی انکے منقبت کے اشعار بھی کرتے ہیں،البتہ یہ کہنا کہ زندگی کے کن مراحل میں انھوں نے اسلام قبول کیا ایک مشکل امر ہے۔آپ کے تاریخ انتقال میں بھی اختلاف ہے،بعض تذکرہ نگاروں نے آپ کی عمر ۶۱ سال درج کی ہے تو بعض نے ۶۵ سال بتایا ہے۔

نتیجہ:

رتن سنگھ زخمی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس نے فارسی کے دامن کو ایسے وقت میں مالا مال کرنے کی کوشش کی ہے جو زمانہ فارسی کے زوال کا تھا جب اکثر شعراء فارسی کو چھوڑ کر اردو کا رخ کر رہے تھے۔قابل غور بات یہ ہے کہ زخمی نے انتظامی مصروفیات کے باوجود فارسی میں جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا،انکی چند تصنیفات ایسی ہیں جیسے معیار الزمان، جام گیتی نما جن کا تذکرہ تو ملتا ہے لیکن ان کتب کا پتہ نہیں چل سکا ہے کہ یہ کتابیں کن لائبریریوں میں ہیں، ہیں بھی یا ضائع ہوچکی ہیں۔اس کے علاوہ انکی چند تصنیفات جیسے انیس العاشقین اور حدائق النجوم کا حوالہ دیگر کتابوں اور مقالوں میں دیا جاتا ہے جس سے انکی اہمیت وافادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کے ادبی کردار کے بہت سارے پہلو ابھی اجاگر نہیں ہوسکے ہیں،جس کے سلسلے میں مزید تحقیق جاری ہے اور بہت جلد ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

منابع:۔

۱۔اودھ کے فارسی گو شعراء، ص/۱۸۲....(ڈاکٹر زہرہ فاروقی)

۲۔نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان، ص/۱۲۹....(ڈاکٹر نرندر بہادر)

۳۔دیوان رتن سنگھ زخمی، ص/۵ (غزل نمبر ۹).....(رتن سنگھ زخمی)

۴۔ایضا، ص/۵۰۶ (اولین رباعی).....(رتن سنگھ زخمی)

۵۔شرح گل کشتی، ص/۱.....(رتن سنگھ زخمی)

۶۔ایضا، ص/۱۹۸.....(رتن سنگھ زخمی)

۷۔ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ص/۲۱۹.....(ڈاکٹر سید عبداللہ)

☆☆☆

اظہار احمد
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

شاہؒ اھل اللہ پھلتی مولف چہار باب: ایک تعارف

چکیدہ: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خانوادہ کے رکن رکین برادر خورد شاہ ولی اللہؒ فارسی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ علوم طب پر دسترس رکھتے تھے آپ نے علم طب کی مشہور کتاب طب یونان اور تکملہ ھندی کی فارسی میں تصنیف فرمائی فقہ فارسی میں چہار باب آپ کی مایہ ناز تصنیف ہے جو اپنی معنویت و معتبریت میں ضرب المثل ہے۔ چہار باب تمام ہندوستانی لائبریریوں اور کتب خانوں سے ندارد ہے بعد تلاش بسیار ''چہار باب'' دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ میں دستیاب ہوئی۔ بندہ ناچیز نے اصل نوشتہ کا عکس حاصل کیا ہے۔ بندہ کے پیش نظر ہے
کلیدی الفاظ: شاہ اھل اللہؒ پھلت مظفر نگر، چہار باب، فقہ فارسی، خانوادہ شاہ ولی اللہ

شاہ اھل اللہ۔ شاہ عبدالرحیم کی دوسری بیوی صاحب زادی فخر النساء بیگم کے بطن سے 1119ھ/ 1708ء میں قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے آپ شاہ ولی اللہ کے حقیقی بھائی تھے تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد شاہ عبدالرحیم اور بڑے بھائی شاہ ولی اللہ اور دیگر اساتذہ سے حاصل کی۔

محمود احمد برکاتی لکھتے ہیں: شاہ اھل اللہ 1119ھ/ 1708ء میں پھلت میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علوم اپنے والد ماجد، بڑے بھائی اور دوسرے اساتذہ سے حاصل کیا۔ (شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ص۵۴) آپ کو علوم دینیہ و عقلیہ کے ساتھ ساتھ علوم طب میں ملکہ حاصل کیا تھا آپ ایک ماہر نباض اور قیافہ شناس تھے چنانچہ آپ نے بطور پیشہ طب و حکمت کو اختیار فرمایا طبی تجربات اور مرض شناسی میں بینظیر تھے جس کا تذکرہ خود شاہ ولی اللہ نے اپنے رسالہ بوارق الولایۃ میں بڑی وضاحت سے فرمایا ہے لکھتے ہیں (از ہر علم بہرۂ معتد بہ داشتند و ترک مناسبت بفنی از فنون طبع ایشان رضا نمی داد در طب حدس ایشان بغایت سلیم و رسا بود) (بوارق الولایۃ مشمولہ انفاس العارفین ص۸۴) شاہ عبدالعزیزؒ حضرت شاہ اھل اللہ کے علاج و معالجہ کے تعلق سے فرماتے ہیں کہ ہمارے خاندان میں طباعت کا سلسلہ تھی اور میرے دادا اور چچا حکمت کرتے تھے۔ آپ لکھتے ہیں (حکمت ھمہ در خاندان ما معمول بود چنانچہ جد بزرگ وار وعم فقیری کردند) (ملفوظات عزیزی ص۲۲)

الغرض آپ تمام علوم فقھیہ و عقلیہ سے فراغت اور برادر بزرگ سے دستار خلافت پا کر دہلی سے پھلت آ گئے اور یہیں اپنی زندگی گزار دی اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ محمود احمد برکاتی نے رود کوثر کے حوالے سے لکھا ہے۔ والد کے انتقال کے بعد کچھ مدت ہی اھل اللہ دہلی میں رہے اور پھر پھلت منتقل ہو کر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ (شاہ ولی اللہ اور انکا خاندان ص۱۵۴)

آپ نے 1186ھ میں پھلت میں رحلت فرمائی اور درگاہ کے اندر مدفون ہوئے خاکسار آپ کے قبر اطہر پر حاضر ہوا اور آپ کے قبر کا عکس بھی حاصل کیا وہاں چار احباب مدفون ہیں نیز وہ گھر جہاں ولی اللہؒ کی ولادت ہوئی اور شاہ اھل اللہ کا مسکن تھا وہ بھی عکسی شکل میں موجود ہے۔

آپ نے بڑی اہم کتابیں تصنیف کیں۔جن میں ترجمہ فارسی کنز الدقائق،حقائق الصلوۃ تخریج احادیث ھدایہ انفاس رحیمیہ تلخیص ھدایہ فوائد اور چہار باب ہیں۔

چہار باب: چہار باب فقہ میں لکھی گئی فارسی نوشتہ ہے۔خط نستعلیق ہے باون صفحات ہیں۔اصل نوشتہ اور حاشیہ دونوں کی زبان فارسی ہے۔

چہار باب کتاب سے نام سے ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ اس میں چار باب پائے جاتے ہیں۔

پہلا باب۔عقاید لازمہ باب دوم اعمال شریعت جن کا تعلق فرائض واجبات اور سنن ومستحبات سے ہے باب سوم فضائل اعمال اور باب چہارم میں مفید نصیحتیں جو عوام اور خواص کے لئے یکسان طور پر مفید ہیں پائی جاتی ہے۔

باب اول میں اھل سنت والجماعت کے جملہ تیس عقیدوں کا تذکرہ ہے جن پر عمل آوری نجات ونجاح کے لئے ضروی ہے۔پہلے عقیدہ میں شاہؒ اس بات کو واضح انداز میں پیش کرتے ہیں کہ عالم اور عالم کی تمام چیزیں معدوم وناپید تھیں جو خدا تعالی کے وجود بخشی سے ظاہر ہوئیں۔پھر ان تمام کو فنا ہونا ہے۔اللہ تبارک وتعالی کے علاوہ ساری انسانیت تمام عالم فناپذیر ہیں۔آپ لکھتے ہیں ''عقیدہ باید دانست کہ عالم بجمیع اجزای خویش حادث ونو پیداست یعنی نبود بعد ازان پیدا شد وہر پیدا شوندہ را پیدا کنندہ لازم است و پیدا کنندہ عالم اللہ تعالی است۔'' (چہار باب ص۲) اسی طرح دیگر عقاید میں خدا کی ذات وصفات میں تغیر وتبدیلی نہ آنا اس کے کلام کا قدیم ہونا تمام انسانیت کا آدم کی اولاد اور فرشتوں کا مخلوق ہونا۔میزان عمل کا قیام،کرامات اولیاء معجزات ربانیہ،حقانیت قیامت اور حساب وکتاب جیسے عقاید اس باب میں پائے جاتے ہیں سب سے آخری عقیدہ جو شاہ اھل اللہ نے بیان کیا وہ ایصال ثواب کے درست ہونے سے متعلق ہے کہ زندوں کی جانب سے ایصال ثواب مردوں کے لئے نفع بخش ہے چاہے وہ تسبیح وتھلیل اور دعاء مغفرت کے ذریعہ ہو لکھتے ہیں ''عقیدہ بعد مردن مردگان را از زندگان نفع وثواب میرسد اگر صدقہ برائے ایشان دھند ودعاء وتسبیح و تھلیل از برای ایشان کنند۔'' (چہار باب ص ۷)

باب دوم ضروری فقہی مسائل سے متعلق جس میں اولا نماز پنجگانہ کی فرضیت وضو کے فرائض ومسنونات کیساتھ نواقض وضو اور غسل وتیمّم اور حیض ونفاس وغیرہ سے متعلق جملہ پچاس مسئلہ بیان کئے ہیں آپ لکھتے ہیں باب دوم در ذکر مسائل ضروریہ فقھیہ۔ (چہار باب ص ۸)

اول مسلہ کے تحت ''باید دانست کہ بناء اسلام بر پنج چیز است اول گواھی دادن بانکہ نیست ہیچ معبودی بحق مگر اللہ تعالی و محمد صلی اللہ علیہ وسلم بتحقیق فرستادہ و پیغامبر اوست دوم بر پا داشتن نماز پنجگانہ سوم داشتن روزۂ ماہ رمضان چہارم دادن زکوۃ مال خود پنجم حج کردن خانہ کعبہ را (چہار باب ص ۸) اس باب کا آخری مسئلہ میں شاہ اھل اللہؒ نے واجبات دین اور چند ضروری آئین مثلا عزیز واقارب پر خرچکرنا صدقہ عید الفطر والدین کی خدمت عمرہ کی ادائیگی اور لفظ اللہ کے سننے پر تعظیم بجالانا آپ ﷺ کے نام مبارک سننے پر درود بھیجنا سلام کے جواب کو لازمی جاننا وغیرہ بیان کیا ہے۔

لکھتے ہیں۔مسئلہ واجبات دین وآئین چند چیز است نفقہ ذی رحم محرم وصدقہ عید الفطر وقربانی وخدمت والدین وخدمت زوج زوجہ را وعمرہ ادا کردن ولفظ اللہ شنیدہ تعظیم نمودن ولفظ محمد شنیدہ درود فرستادن وجواب سلام وجواب عطس فرض کفایت شمردن۔ (چہار باب ص ۲۳)

باب سوم میں ان تمام اعمال کا تذکرہ کیا ہے جو درجہ استحباب ومذب رکھتے ہیں کہ اگر چہ درجہ وجوب میں نہیں ہیں مگر ان اعمال کے تعلق سے رسالت مآب ﷺ کی جانب سے بے شمار فضیلتیں بیان کی گئی ہیں اس باب میں جملہ تیرہ فضیلتوں کا تذکرہ ہے

جس میں سب پہلی فضیلت نماز کے تمام اہتمام سے ادائیگی اور مداومت سے متعلق ہے نماز کی مواظبت اور مداومت پر مختلف آیات قرآن کو مستدل بنایا بالخصوص نماز عصر کی اہمیت و وقعیت کو اجاگر فرماتے ہوئے آیت کریمہ وامر اھلک بالصلوۃ واصطبر علیھا اور واقم الصلوۃ طرفی النھار وزلفا من الیل پیش فرمایا آپ لکھتے ہیں (حافظوا علی الصلوت والصلوۃ الوسطی وقوموللہ قانتین یعنی محافظت بکنید برنمازھا وبرنماز عصر واستادہ شوید درنماز برای خدا خشوع کنندہ۔(چہار باب ص ۲۳)

آخری فضیلت میں شاہ قرآن مجید کی تلاوت کی ترغیب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قرآن تو تمام کا تمام پڑھنا باعث رحمت و برکت ہے مگر چند سورتیں مخصوص حالات اور زمانہ سے رشتہ رکھتی ہیں جنہیں اسی حساب سے پڑھنا چاہئے چنانچہ آپ لکھتے ہیں فضیلت ہر چند کہ ہر آیت قرآن مجید کافی ووافی است برای ھر مطلبی کہ خواند درشان آن خذمن القرآن ماشئت لماشئت واقع است اما تمام خواندن قرآن مجید درھفت روز برین ترتیب اسرع دراجابت است۔(چہار باب ص ۲۳)

اس کے بعد شاہ نے مخصوص دنوں میں مخصوص سورتوں کا وظیفہ متعین فرمایا اور سب سے اہم بات جو شاہ نے قبولیت اعمال کیلئے لازم گردانا وہ اخلاص نیت ہے۔ آپ نے حدیث شریف انما الاعمال بالنیات لاکر اس باب کو مکمل فرمایا۔

باب چہارم ضروری نصائح سے متعلق ہے جس میں جملہ چھبیس نصیحتیں ہیں پہلی نصیحت میں شاہ واضح فرماتے ہیں کہ انسان تمام فطری تقاضوں میں گہرا ہوا ہے اسباب دنیا ہر چہار جانب سے اپنی بندش میں لی رکھی ہے اس لئے وہ دنیا اور اسباب سے دنیا قطعا لاتعلق نہیں ہوسکتا چاہ نہ چاہ کراز تقاضاء بشریت امور دنیا میں ملوث ہوگا۔مگر وہ اس میں منھمک نہ ہوجائے کہ فکر آخرت سے بے نیاز اور امور دنیا میں گرفتار ہوجائے دنیوی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے۔مقصد حیات احکام الٰہی کی بجا آوری اور اطاعت رسول کو جاف جانے نیز ہر چیز میں درمیانی رویہ اپنائے۔چنانچہ آپ لکھتے ہیں وھر یکی ازین امور افراط است وتفریط نہ افراط ان را نھایت ونہ تفریط آن را غایت پس لازم آنگہ در جملہ امور خود توسط اختیار نماید کہ خیر الامور اوسطھا واقع شدہ۔(چہار باب ص ۳۷)

سب سے آخری نصیحت میں شاہ روز ہائے زندگانی کو پیش بہا نعمت خداوندی قرار دیتے ہوئے دنیوی زندگی کو آخرت کی کھیتی سے تعبیر کرتے ہیں کہ انسان اچھے اعمال و کردار کے ذریعہ آخرت کی پونجی تیار کرتے اور ہمیشہ اعمال صالحہ کے اپنانے کردار خبیثہ سے بچنے کی فکر کرے اور جانکنی کے عالم سے پہلے توبہ واستغفار اور کلمہ طیبہ کا ورد جارر کھے نیز اپنی موت پر عزیز واقارب کو صبر کی تلقین کرے۔آپ لکھتے ہیں ''نصیحت ایام حیات خود راغنیمت دانستہ الدنیا مزرعۃ الاخرہ شمارند ودل را برا عمال نیک گمارند چوں قریب لمرگ رسند بکثرت استغفار وتہلیل اشتغال خود نمایند۔(چہار باب ص ۳۴)

ان چار باب کے اختتام پر ایک خاتمہ ہے جس میں مصنف نے چہار باب کے لکھنے کے باعث کو بتلایا کہ لوگ کثرۃ مشاغل کے سبب فقہ کے اہم مسائل سے واقفیت حاصل نہیں کرسکتے اس لئے بندہ نے چاہا کہ ایسی کتاب لکھی جائے جو بروقت تمام مسائل لازمہ کا احاطہ کرے اور کم وقت میں تمام لازمی چیزوں کی اطلاعات پہونچادے۔چنانچہ آپ لکھتے ہیں امابعد می گوید بندہ درگاہ کریم محمد اھل اللہ ابن شاہ عبدالرحیم کہ باعث برتصنیف این رسالہ وتالیف این مقالہ ان شد کہ طلب علم بر ہر مسلمان فرض است و ھمم از تحصیل ان نہایت قاصر اند بنا بران مناسب چنان نمود کہ ضروریات عقاید وفقہ وافضل فضائل اعمال ونصائح وحکم علی سبیل الایجاز والاختصار دراوراقی چند مرقوم گردد تاھر کہ خواند درعرصہ قلیلہ وایامی متعددہ بتحصیل ان فائز شود۔(خاتمہ چہار باب ص ۴۳)

چہار باب کی تکمیل پر شاہ نے اللہ تبارک وتعالی کے ناوے ناموں کی تشریح فرمائی ہے۔

آپ نے الاحد کی تشریح کے تحت ایک مثنوی بھی پیش کی ہے۔

احداست وشمار از ومعزول۔ صمداست ونیاز از ومخذول

آن احد کہ حس شناسد و دھم۔ ان صمد نی کہ عقل داند و فھم (چہار باب ص ۴۶)

کتاب کے آخری صفحہ پر مختلف قطعات و رباعی پائے جاتے ہیں جن کے ذریعہ چہار باب کی تاریخ نوسیدگی وطبع کو شعری شکل میں پیش کیا گیا ہے۔سب سے پہلا قطع مفتی سعداللہ صاحب اور آخری عبدالرحمان خلف محمد روشن خان کا ہے:

قطعہ مفتی سعد اللہ — چو شد مطبع نسخہ چہار باب
جہانی شد از دیدنش بہرہ یاب — ز آشفتہ شد سال تاریخ او
بہ چھاپ شد نسخہ چہار باب — قطع عبدالرحمان
چون مختصر مسائل حنفی چہار باب — مطبوع گشت و بہر خلائق مفید شد
تاریخ طبع از سر جلدی خرد بگفت — از طبع چار باب جہاں مستفید شد

(چہار باب ص ۵۲)

اس پر حاشیہ فارسی سعدالدین کا ہے سال 1285 ھجری میں مطبع مصطفائی محلّہ محمود نگر بیت السلطنت لکھنو سے محمد مصطفیٰ خان کے اھتمام سے شائع ہوئی۔وتحشیہ وتصحیح کمترین سعدالدین غفراللہ خطیئتہ سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

منابع و مآخذ:

1۔شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان مصنف محمود احمد برکاتی صفحات ۱۶۸،طباعت ۲۰۰۱،مطبع دہلی۔
2۔بوارق الولایۃ مشمولہ انفاس العارفین ص ۸۴۔سالہ اشاعت ۱۲۳۸ھ۔
3۔ملفوظات عزیزی ص ۲۲۔ شاہ عبدالعزیز صفحات ۱۱۸۰ اشاعت ۱۲۶۸ھ۔مطبع مصطفائی لکھنو۔
4۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ص ۱۵۴ مصنف محمود احمد برکاتی صفحات ۱۶۸،طباعت ۲۰۰۱،مطبع دہلی۔
5۔ چہار باب ص ۲۔شاہ ولی اللہ اھل اللہ صفحات ۵۲ سال اشاعت ۱۲۸۵ مطبع مصطفائی لکھنو۔
6۔چہار باب ص ۷۔شاہ ولی اللہ اھل اللہ صفحات ۵۲ سال اشاعت ۱۲۸۵ مطبع مصطفائی لکھنو۔
7۔چہار باب ص ۸۔شاہ ولی اللہ اھل اللہ صفحات ۵۲ سال اشاعت ۱۲۸۵ مطبع مصطفائی لکھنو۔
8۔چہار باب ص ۲۳۔شاہ ولی اللہ اھل اللہ صفحات ۵۲ سال اشاعت ۱۲۸۵ مطبع مصطفائی لکھنو۔
9۔چہار باب ص ۲۳۔شاہ ولی اللہ اھل اللہ صفحات ۵۲ سال اشاعت ۱۲۸۵ مطبع مصطفائی لکھنو۔
10۔ چہار باب ص ۲۳۔شاہ ولی اللہ اھل اللہ صفحات ۵۲ سال اشاعت ۱۲۸۵ مطبع مصطفائی لکھنو۔
11۔چہار باب ص ۳۳۔شاہ ولی اللہ اھل اللہ صفحات ۵۲ سال اشاعت ۱۲۸۵ مطبع مصطفائی لکھنو۔
12۔ چہار باب ص ۳۴۔شاہ ولی اللہ اھل اللہ صفحات ۵۲ سال اشاعت ۱۲۸۵ مطبع مصطفائی لکھنو۔
13۔ چہار باب ص ۴۳۔شاہ ولی اللہ اھل اللہ صفحات ۵۲ سال اشاعت ۱۲۸۵ مطبع مصطفائی لکھنو۔
14۔ چہار باب ص ۴۶۔شاہ ولی اللہ اھل اللہ صفحات ۵۲ سال اشاعت ۱۲۸۵ مطبع مصطفائی لکھنو۔
15۔ چہار باب ص ۵۲۔شاہ ولی اللہ اھل اللہ صفحات ۵۲ سال اشاعت ۱۲۸۵ مطبع مصطفائی لکھنو۔

☆☆☆

شفقت حسین (شکیب)
ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

فارسی ادب میں حبسیات کی روایت

چکیدہ: ادبیات حبسیہ یا ادبیات زندان، ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں قید کے اندر یا قید کے باہر قید کے واقعات و تجربات موثر انداز میں پیش کئے جائیں۔ حبس یا زندان جیل کے مترادف ہے جو قدیم زمانے سے بطور ایک سیاسی آلہ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ جس میں حکومت کے مخالفین و معتوبین کو قید و بند کیا جاتا ہے اور ملزم و مشتبہ افراد کو اپنی دلخواہ آزادی سے محروم رکھا جاتا ہے۔ لغت نامہ دھخدا میں واژہ حبس بمعنی ''زندان، بند خانہ، قید خانہ، باز داشت، قید کردن، بند کردن'' میں استعمال ہوا ہے۔(۱)

کلیدی الفاظ: حبسیات، فارسی شاعری، تہذیب و تمدن، مسعود سعد سلمان

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں (غالبؔ)

مشرقی دنیا میں ابھی تک کوئی بھی معتبر تحقیق تاریخ زندان و زندانیت پر انجام پذیر نہیں ہوئی اس کے برعکس مغربی علماء و دانشمندوں نے قید و مجازات پر قابل تعریف تحقیقات انجام دی ہیں اور اس باب میں مختلف نظریات و افکار کا اظہار بھی کیا ہے۔ میشل فوکو "Micheal Focult" اپنی کتاب "Discipline and Punishment" میں تاریخ و روش زندان پر مفصل طور پر بحث کی ہے۔ بقول فوکو جدید دور سے قبل ملزموں کو قید خانوں میں وحشت ناک سزائیں دی جاتی تھیں لیکن بتدریج ۱۸ ویں صدی کے بعد مجازات بدنی کو مجازات نفسیاتی میں تبدیل کیا گیا۔(۲)

ایران میں بھی جو کہ تاریخی و تمدنی اعتبار سے ہزاروں سال کی تاریخ پر مشتمل ہے، ملزموں، محکوموں اور غلاموں کو سزائیں دینے کے لئے یا ان کی اصلاح کے لئے مختلف آلات کا استعمال کیا جاتا رہا ہے جس میں حبس یا زندان ایک نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ ہر چند ابھی تک ایسی کوئی بھی تحقیق انجام پذیر نہیں ہوئی ہے جس سے یہ معلومات اخذ کئے جائیں کہ فارسی دنیا کے قید خانوں میں کس نوعیت کی سزائیں مجرموں کو دی جاتی تھی۔(۳)

بہر حال تاریخ بشر اور بشریت میں حبس یا قید خانہ بھی دوسرے قدرتی اور تاریخی عوامل کی طرح ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے جیل کے سیاہ خانوں کے تجربات جب احساسات کی شکل میں صفحۂ قرطاس پر منقوش ہوتے ہیں تو انہیں حبسیہ کہا جاتا ہے۔ فارسی ادب میں حبسیہ کی اصطلاح پہلی بار چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی میں مسعود سعد سلمان کے ذکر کے حوالے سے استعمال ہوئی ہے۔(۴)

اس کے علاوہ رشید الدین وطواط کی حدائق السحر فی الدقائق الشعر میں بھی لفظ حبسیہ مسعود سعد سلمان کے ساتھ ہی آیا

ہے۔جس کے بعد لفظ حبسیہ ایک باقاعدہ ادبی صنف کے معنوں میں استعمال ہونے لگا جس میں حقیقی قید یا نقل وحرکت پر جبریہ پابندی مثلاً نظر بندی کے واقعات وحالات، دوران قید کی روزمرہ زندگی، مصنف کے ذاتی مشاہدات وتاثرات اور مصنف پر گذرنے والی ذہنی کیفیات کا بیان مندرج ہو۔(۵)

یا بہ عبارت دیگر ملزم یا متہم کے روزگار تلخ اسیری کا آئینہ دار ہو۔عالمی ادب کی تاریخ میں ہم بارہا ادبیات حبسیہ سے روبرو ہوتے ہیں، جو مختلف ادبی شکلوں میں مثلاً شعر، نثر، مکتوبات، تاریخ، فلسفہ یا خاطرات پر مبنی ہے۔عالمی ادب میں زندان کے سیاہ خانوں میں تحریر شدہ ادب کی بہترین مثال "Boethus" کی "Philosophy of Consolation" ہے جو چھٹی صدی عیسوی میں اٹلی کے تاریخی شہر روم میں لکھی گئی۔اس کے علاوہ "Oscar Wild" کا رسالہ "De Profundis" بھی عالمی حبسیہ ادب کے شہکاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔لیکن فارسی ادب میں عمومی طور پر حبسیہ کو صرف شعری اصطلاح تک محدود رکھا گیا جب کہ فارسی نثر میں اور خاص کر جدید فارسی نثری ادب میں ایسی وافر مثالیں ہیں جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فارسی حبسیہ کا دامن اتنا وسیع ہے کہ اس میں نہ صرف شعری حبسیات بلکہ نثری حبسیات بھی شامل کئے جاسکتے ہیں۔

فرہنگ معین اور فرہنگ عمید میں حبسیہ کی تعریف اس طرح سے کی گئی ہے۔''شعر کہ شاعر در مدت زندانی بودن در شکایت از حال و بیان و رنجہای خود می سراید۔''(۶)

اس کے علاوہ معروف محقق اور دانشمند مثلاً زرین کوب، داکٹر فرشید ورد، زین العابدین موتمن اور سروش شمیسا نے ادبیات حبسیہ کو صرف شعری قالب تک محدود رکھا۔بقول زرین کوب''شاعران کہ گہ گاہ در بیان مصائب و آلائم خویش۔فردی۔یا اجتماعی سرودہ اند بہ این گونہ مراثی ملحق کرد۔''(۷)

زرین کوب کے اس قول کے متعلق بجا طور پر یہ اعتراف کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر نوع مرثیہ کو شعر حبسیہ میں شمار نہیں کیا جاسکتا اگر چہ حبسیہ شاعری میں شاعر بیشتر اپنے مصائب ورنج وآلائم وغم واندوہ کو بیان کرتا ہے اور وہی مصائب ایک مرثیہ گو مرثیہ میں قلمبند کرتا ہے لیکن جو مشخصات حبسیہ کو مرثیہ سے جدا کرتی ہیں وہ یہ کہ ادبیات حبسیہ صرف اور صرف جیل یا زندان سے منسلک ہوتا ہے اور مزید برآن مرثیہ صرف شعری قالب میں لکھا جاتا ہے جب کہ حبسیات مختلف انواع ادبی میں چاہے وہ منظوم ہو یا منثور رقم کیا جاتا ہے۔

زرین کوب کے اس بیان سے مرثیہ میں پائے جانے والے رنج ومصائب اور حبسیات میں زندان کے سیاہ خانوں کی آہ وزاری باہم مخلوط ہوجاتی ہے جبکہ فنی اصطلاحات کے اعتبار سے مرثیہ اور حبسیہ جداگانہ ہے۔استاد فرشید ورد نے حبسیہ کو انواع شکایت نامہ میں شمار کیا ہے۔(۸) جب کہ زین العابدین مئتمن نے بھی حبسیہ کو حسب حال وشکوہ شکایت تک محدود رکھا ہے۔(۹)

بقول سروش شمیسا حبسیات بھی دوسرے انواع ادبی جیسے شہر آشوب، مرثیہ اور ساقی نامہ کی طرف شعر غنائی میں شمار ہوتا ہے۔اسی طرح سے ڈاکٹر منصور رستگار فسائی اپنی تصنیف انواع شعر فارسی میں بھی حبسیات یا زندان نامہ کو اقسام شعر میں شمار کرتے ہیں۔(۱۰)

لیکن یہ بات بھی بجا طور پر کہنا لازمی ہے کہ فارسی کلاسیک ادب میں حبسیات بیشتر شعری قالب میں پائے جاتے ہیں لیکن بیسوی صدی کے آتے آتے سیاسی، اجتماعی اور جنگی کشمکشوں نے نہ صرف دنیا کے نظام کو بدلا بلکہ ادبی اعتبار سے بھی طرح طرح کے انقلابات رونما ہوگئے جس کے گہرے اثرات جدید فارسی ادب پر بھی پڑے نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں حبسیہ ادب کی روایت صرف شعری قالب تک محدود تھی وہاں حبسیہ کو نثری ادب میں بھی جگہ ملی۔ایران وعراق جنگ کے دوران سینکڑوں حبسیہ خاطرات

قلمبند ہوئے جو کہ صرف اور صرف نثری قالب میں تحریر ہیں۔اس طرح کے انقلابات نے لفظ حبسیہ کو اور گسترده کر دیا۔

"Quentin Skinner" کے نظریہ کے مطابق کسی بھی ادبی متن یا اصطلاح کی تفسیر صرف اس کے ظاہری ساخت یا اس کے تحت اللفظی معنی سے نہیں کی جاسکتی بلکہ اس بات پر بھی غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے کہ لکھتے وقت مصنف کے ذہن پر کس طرح کی کیفیات طاری تھیں۔یہ الگ بات ہے کہ ایک حبسیہ شاعر کی ذہنی کیفیات میں اور نثر نویس کی ذہنی کیفیات میں تسلسل ہوسکتا ہے باوجود اس کے کہ دونوں کی تخلیقات کے قالب جدا ہیں۔(۱۱)

حبسیہ کے اس تاریخی پس منظر کے بعد ادبیات فارسی میں حبسیہ کی روایت کا مختصر جائزہ پیش خدمت ہے:

فارسی زبان کے معروف ترین شعراء جو کہ مختلف ادوار میں مختلف وجوہات سے مختلف قید خانوں میں قید ہوئے ہیں اور جنہوں نے ادبیات حبسیہ کو اپنے درد و نالوں سے اور خاص کر علم و دانش و فلسفہ سے لایزالی کیا ان میں بطور خاص مسعود سعد سلمان، خاقانی شروانی، فلکی شروانی، مجیر بیلقانی، فرخی یزدی، محمد تقی بہار، غالب دہلوی وغیرہ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔فارسی میں حبسیہ شاعری کی روایت پہلی بار غزنوی دور میں دیکھنے کو ملتی ہے۔مسعود سعد سلمان چونکہ غزنوی دور کے شاعر تھے اس لئے ان کو فارسی حبسیہ شاعری کا سرخیل تصور کیا جاتا ہے۔مسعود سعد سلمان کی زندگے کے اوائل دور کے بارے میں کوئی بھی اطلاع ابھی تک فراہم نہیں ہوئی ہے سوائے اس کے کہ مقدمہ کی تحصیلات اپنے والد بزرگوار سعد سلمان سے حاصل کی، جو کہ خود اپنے دور کے چوٹی کے علماء میں شمار ہوتے تھے اور تقریباً ۶۰ سال تک غزنوی دربار میں خدمت انجام دیتے رہے۔بقول مسعود سعد سلمان:

شصت سال تمام خدمت کرد پدر بنده سعد بن سلمان
گه به اطراف از اعمال که به درگاه بودی از اعیان (۱۲)

مسعود سعد نے اپنی ۷۵ سالہ زندگی میں تقریباً بیس سال جیل کے سیاہ خانوں میں گذار دئے۔ان بیس سالوں میں وہ جن جیلوں میں رہے ان میں سرفہرست قلعہ دہک، زندان سو اور قلعہ نای ہے۔

هفت سال به کوفت سوو دهک پس از آنم سه سال قلعه نای (۱۳)

مسعود سعد سلمان کے حبسیات جس قدر ادبی اہمیت کے حامل ہے اتنا ہی تاریخی اعتبار سے بھی اہمیت رکھتے ہیں ان کی حبسیہ زندگی کا پر رنج ترین دور قلعہ نای میں گذرا جس کی ترجمانی وہ خود ان اشعار میں کرتے ہیں:

نالم به دل چونای من اندر حصار نای پستی گرفت همت من از این بلند جای
آرد هوای نای مرا ناله های زار جز ناله های زار چه آرد هوای نای
از رنج تن تمام نی آرم نهاد پی وز درد دل بلند نی آرم کشید وای (۱۴)

مسعود سعد سلمان کے حبسیات کے متعلق رشید الدین وطواط رقمطراز ہے کہ مسعود سعد سلمان کے بیشتر اشعار کلام جامع ہے خاص کر جو اس نے دوران اسیری میں لکھا ہے اور اس طرز میں ان کا نظیر نہیں۔(۱۵)

خاقانی شروانی بھی مسعود سعد سلمان کی طرح حبس کے شکار ہوئے ہیں ان کا اصلی نام افضل الدین بدیل تھا شروعاتی دور میں حقائقی تخلص استعمال کرتے تھے لیکن بعد میں شیروان شاہ ابوالمظفر خاقان سے ملاقات کے بعد خاقانی بطور تخلص اختیار کیا۔ان کی مدت زندانی بہ نسبت مسعود کم تھی۔سید ضیاء الدین سجادی دیوان خاقانی کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

''از مہم ترین حوادث زندگی او مسافرت ہا است، حادثہ مہم دیگری از دوران حیات شاعر یاد کردنی است، گرفتاری او در زندان است کہ نوشتہ اند بی اجازت شیروان شاہ بیرون رفتہ بہ مدت ھشت ماہ بہ امر احتان پادشاہ شروان زندانی شدہ است۔در ھمین

وقت قصیدہ معروف بہ ترسائیہ رابہ مطلع:

فلک کجرو ترا ست از خط ترسا مرادارد مسلسل راہب آسا'' (۱۶)

چھٹی صدی ہجری کے معروف انشاء نگار بہاء الدین بغدادی نے بھی جیل کی ظلمت کا دور دیکھا ہے ان کی مشہور تصنیف التوسل الی الترسل ہے جو کہ بہمن یار کے اہتمام سے اور علامہ قزوینی کے مقدمہ کے ساتھ زیور طبع آراستہ ہوئی ہے۔

یہ کتاب بہاء الدین بغدادی کے منشات کا مجموعہ ہے اور ایک مقدمہ اور پنج فصلوں پر مشتمل ہے جس میں ایک فصل رسالہ زندان شادیاخ کے نام سے ہے جو کہ زندان شادیاخ میں دوراسیری میں لکھا گیا ہے۔ یہ رسالہ گلستان سعدی کی طرح نظم ونثر میں آمیختہ ہے اور قید خانہ میں موصوف پر گذرنے والے حالات کا آئینہ دار ہے۔ فارسی حبسیہ ادبیات میں تاریخی اعتبار سے دو طرح کے انقلابات رونما ہوئے ہیں اول تو یہ کہ ادبیات حبسیہ کی شروعات شعری روایت سے ہوئی اور ایران سے لیکر ہندوستان تک جتنے بھی شاعر جو کسی بھی اتہام کے حوالے سے چاہے وہ غالب کی قمار بازی ہو یا خاقانی شروانی کی نافرمانی ہو قید ہوئے ہیں انہوں نے ادبیات حبسیہ میں اضافہ کیا ہے۔ دوم یہ کہ جدید دور کے شروع ہوتے ہی ادبیات حبسیہ میں منثور تصانیف کا از حد اضافہ ہوا جن میں سیاسی اور اجتماعی مسائل پر زیادہ توجہ دی گئی۔ بزرگ علوی کی تصانیف (ورق پارہای زندان) اور (سی وپنج نفر) جدید ایران میں سیاسی اور سماجی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ورق پارہ ہای زندان جو کہ قید خانہ میں لکھی گئی لیکن اس میں قید کے باہر کے سیاسی اور سماجی واقعات مندرج ہیں اسی طرح سے ''سی وپنج نفر'' قید خانے کے باہر لکھی گئی ہیں لیکن اس میں دوراسیری کے واقعات مندرج ہیں۔

ایران عراق جنگ کے دوران اور خاص کر جنگ کے خاتمہ کے بعد ایرانی حکومت نے آثار دفاع مقدس کو جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا اور دفاعی مقدس سے متعلق ہر چیز کو محفوظ کیا گیا۔ جس میں سیکڑوں تعداد میں خاطرات حبسیہ بھی شامل ہیں ان میں کچھ خاطرات حبسیہ ایسے ہیں جو زبانی بیان کے گیے اور بعد از آن تحریر ہوے. ان میں سرفہرست نسیم تقدیر از محمد جواد سالاریان اور حکایت زمستان از عباس حسن مردی ہیں۔

حواشی:

۱۔لغت نامہ دھخدا، ذیل واژہ حبس، سال انتشار ۱۳۸۲۔

۲۔ Focult,Micheal,Discipline and Punishment,the birth of the prison,Penguin books,1991,PP 3-31.

۳۔مرتضیٰ راوندی نے سیر قانون وداد گستری در ایران میں اس باب پر ہلکی سی روشنی ڈالی ہے۔

۴۔ چہار مقالہ نظامی عروضی بہ اہتمام استاد دکتر محمد معین، تہران ۱۳۷۷، ص ۱۵۰۔

۵۔ج۔ع واجد، حبسیات، مجلّہ فکر وتحقیق، شمارۂ جنوری تا مارچ ۲۰۱۶۔

۶۔http://WWW.vajehyab.com ذیل واژہ حبسیہ۔

۷۔زرین کوب، شعر بی دروغ، شعر بی نقاب، انتشارات علمی، تہران ۱۳۸۸، ص ۱۵۵۔

۸۔فرشید ورد، خسرو ۱۳۵۷ھ ش، مسعود سعد سلمان تہران مجلۂ گوہر شمارۂ ۶۳، ص ص ۵۱۔۷۱۔

۹۔ولی اللہ ظفری، حبسیہ ادبی فارسی، از آغاز شعر فارسی تا پایان زندیہ، انتشارات امیر کبیر، تہران، ۱۳۸۸، ص ۱۷۔

۱۰۔منصور رستگار فسائی، انواع شعر فارسی، انتشارات نوید، شیراز ۱۳۷۳، ص ۲۶۹۔

۱۱۔ "In Order to be able to interpret the meaning of a text, it is necessry to consider factors other than the text it self"

Skinner Quentin, Motives, Intentions and the Interpretation of texts, new literary history vol.,3 no.2, on interpretation: (winter, 1972) PP 393-408.

۱۲۔ دیوان مسعود سعد سلمان، باب مقدمۂ رشید یاسمی، بہ اہتمام پرویز بابائی، مؤسسۂ انتشارات نگاہ، چاپ اول ۱۳۸۴، ص ۳۱۳۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۲۱۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۰۴۔

۱۵۔ حدایق السحر فی دقایق الشعر، بہ تصحیح و اہتمام عباس اقبال، تہران ۱۳۰۸، مطبع مجلس، ص ۸۲۔

۱۶۔ دیوان خاقانی، بہ اہتمام سجادی، سید ضیاء الدین، انتشارات زوار، تہران، ۱۳۸۵۔

☆☆☆

ڈاکٹر مکرم علی
(شعبۂ فارسی)
شبلی نیشنل (پی۔جی) کالج، اعظم گڑھ (یوپی)

آزاد ہندوستان کا ایک نامور فارسی محقق: ''کبیر احمد جائسی''

چکیدہ: کبیر احمد جائسی نومبر ۱۹۹۶ء میں ایک فعال اور سرگرم زندگی گزارنے کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے، اگرچہ انہوں نے صرف تیرہ برسوں تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ملازمت کی لیکن اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ علی گڑھ کی تعلیمی، ادبی اور علمی دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ افسوس کہ علم و ادب کا یہ روشن اور تابناک ستارہ زبان و ادب کے ماہر اردو کے ممتاز ادیب فارسی کے جید محقق اسلامیات کے معروف اسکالر، کثیر التصانیف، حسن و اخلاق سے متصف پروفیسر کبیر احمد جائسی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے تقریباً ۱۸ سال بعد ۷ر جنوری ۲۰۱۳ء شام پانچ بجے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور علی گڑھ یونیورسٹی علی گڑھ کے اس قبرستان میں ابدی نیند سونے کے لیے سپرد خاک کیے گئے جہاں غیر منقسم ہندوستان کے سیکڑوں آفتاب و ماہتاب دفن ہیں۔ اس مقالے میں راقم نے اس مضمون میں ان کی سوانح حیات، اعزازات اور ان کی چند کتابوں خاص کر انعکاس، سویتی: تاجیکی ادب کے بانی، چند ایران شناس، مثنوی ناہید و اختر، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا: حیات اور کارنامے، ایران کی چند اہم فارسی تفسیروں پر قدرے تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے، ویسے تو جائسی صاحب کی ۲۸ کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں مگر اس مختصر سے مقالے میں ساری کتابوں پر سیر حاصل گفتگو ممکن نہیں۔

کلیدی الفاظ: کبیر جائسی، شبلی کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، تصنیفات

پروفیسر کبیر احمد جائسی ۱۶ر نومبر ۱۹۳۶ء کو جائس ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد ظہیر احمد صاحب اس زمانے میں یوپی کے شہر ضلع اعظم گڑھ میں ملازمت کرتے تھے۔ چنانچہ جائسی صاحب کا بچپن اعظم گڑھ میں گزرا، ان کی ابتدائی سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم شبلی اسکول سے ہوئی، اس کے بعد شبلی کالج میں داخلہ لیا لیکن بی-اے میں فیل ہونے کے بعد اعظم گڑھ کو خیر باد کہہ کر علی گڑھ چلے گئے اور ۱۹۶۱ء میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں بی-اے میں داخلہ لیا، ۱۹۶۳ء میں فرسٹ ڈویژن سے بی-اے پاس کیا اور فیکلٹی میں فرسٹ پوزیشن لانے پر یونیورسٹی میں گولڈ میڈل سے انہیں نوازا گیا، اسی طرح ۱۹۶۵ء میں فرسٹ ڈویژن سے فارسی میں ایم-اے کیا اور ۱۹۷۳ء میں پروفیسر نذیر احمد صاحب کی زیر نگرانی ''دیوان مجیر بیلقانی کے تنقیدی متن کی ترتیب'' کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ مرتب کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد کچھ عرصہ تک عارضی طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے شعبۂ فارسی میں لکچرر رہے، ستمبر ۱۹۷۴ء سے اکتوبر ۱۹۸۰ء تک جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے شعبۂ فارسی میں لکچرر رہے، نومبر ۱۹۸۰ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر میں ریڈر کی حیثیت سے تقرر ہوا، جنوری ۱۹۸۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اسلامیات میں ریڈر کے عہدے سے سرفراز کیے گئے، پانچ سال تک اسی عہدے سے منسلک رہے،

بعدازاں ۱۹۸۹ء میں پروفیسر اور کچھ عرصہ بعد انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے، اسی حیثیت سے نومبر ۱۹۹۶ء میں یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

خوش قسمتی سے اعظم گڑھ کے ابتدائی عہد میں جائسی صاحب کو اپنے وقت کے مشہور اور متبحر علماء کی صحبت سے علمی استفادے کا موقع ملا، ان میں مولانا عبدالسلام ندوی (شعرالہند)، مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا وحیدالدین خان اور شبلی کالج کے استاذ عبدالعلیم صاحب وغیرہ سرفہرست ہیں۔اس کے بعد علی گڑھ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، مولانا ضیاء احمد بدایونی اور پروفیسر نذیر احمد صاحب جیسے عبقری علماء وفضلاء نے ان کی شخصیت سازی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، اسی علمی ماحول میں کبیر صاحب کی تعلیم وتعلم کی تربیت ہوتی رہی، رفتہ رفتہ ان کے یہاں پختگی آتی گئی، گرچہ طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ تصنیف و تالیف کے فن سے آشنا ہو چکے تھے، چنانچہ ان کی پہلی طبع زاد کتاب ''نقوش فانی'' ۱۹۵۸ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی تھی، جب کہ وہ ابھی غالباً انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے، ۱۹۶۹ء میں ان کی اردو فارسی غزلوں کا ایک مجموعہ ''صحرا صحرا'' صبا جائسی کے قلمی نام سے شائع ہوا، ۱۹۷۳ء میں اس مجموعے پر اتر پردیش اردو اکیڈمی کا ایوارڈ ملا، ۱۹۷۵ء میں ان کے مقالوں کا مجموعہ ''بازگشت'' شائع ہوا، اس مجموعہ میں جائسی صاحب نے مجیر بیلقانی احمد کسروی تبریزی اور عبدالعلیم جیسے مستند ایرانی شعراء وادباء کو پہلی مرتبہ ہندوستانی اہل علم سے روشناس کرایا، اسی مجموعے کا ایک مضمون ''اقبال اور حافظ'' بہت عرصہ علمی حلقوں میں موضوع بحث رہا، یوسف خاں کی کتاب ''حافظ اور اقبال'' اس کے بہت بعد شائع ہوئی، ۱۹۷۶ء میں ان کی ایک کتاب ''تاریخی اور علمی مقالے''، ۱۹۷۷ء میں ''تاریخ ادبیات تاجیکستان'' اور ۱۹۷۸ء میں ''آذری'' منظر عام پر آئی، یہ تینوں کتابیں انگریزی اور فارسی زبانوں سے اردو میں ترجمے کے نہایت عمدہ نمونے ہیں، تاریخ ادبیات تاجیکستان اور آذری طلباء واساتذۂ فارسی کے لیے نہایت بیش قیمت اور نئے موضوع پر معلومات افزا تصانیف ہیں، اس کے بعد دو اہم ترجمے (فارسی سے ۱۹۸۲ء میں) ''علامہ اقبال۔مصلح قرن آخر'' اور (۱۹۸۳ء میں تاجیکی سے) ''محمد اقبال'' شائع ہوئی۔

۱۹۷۸ء میں جائسی صاحب کی ایک اہم کتاب ''انعکاس'' شائع ہوئی، یہ کتاب بھی بازگشت کی طرح کبیر صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں بیشتر کا موضوع فارسی ادبیات ہے، یہ مجموعہ مندرجہ ذیل مقالوں پر مشتمل ہے:

۱۔ مجیر بیلقانی شاگرد خاقانی کے دیوان کا تاریخی مطالعہ۔
۲۔ علی شریعتی اور اقبال۔
۳۔ حافظ کی شاعری پر ایک نئی نظر۔
۴۔ اقبال اور جدیدیت۔
۵۔ سعید نفیسی کے علمی اجتہادات جو بقول مجیب اللہ ندوی اس مجموعے کا سب سے قیمتی مضمون ہے۔
۶۔ پروفیسر ہادی حسن کی علمی خدمات۔
۷۔ رمزیت-اقبال کا فن۔
۸۔ محمد شاہی عہد کی ایک نادر غیر مطبوعہ فارسی مثنوی۔

دیوان مجیر کا تاریخی مطالعہ چھٹی صدی کے ایران اور خاص طور سے ماژندران، تبریز، رے، خوارزم اور نواح شروان کی تاریخ سے متعلق ہے، مصنف نے مجیر کے اشعار کے حوالے سے اس تاریخی پس منظر کا وسیع مطالعہ کیا ہے اور ایسے شواہد فراہم کیے ہیں جو ان کے بقول اس دور کی تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دوسرے مضمون علی شریعتی اور اقبال میں دکھایا ہے کہ اقبال کی فارسی شاعری ان کی اردو شاعری سے زیادہ قوی اور مستحکم ہے، ابتداء میں اہل علم نے اس کی طرف توجہ نہیں کیا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کی اہمیت محسوس کی گئی، یہاں تک کہ ایرانی فاضل علی شریعتی نے اس کو اپنا خاص موضوع بنایا اور اس پر بہت کچھ لکھا۔

تیسرا مضمون حافظ کی شاعری پر ایک نئی نظر اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ احمد کسروی کی حافظ اور اس کی شاعری پر ایک تنقید اور اس پر کبیر صاحب کا عالمانہ تبصرہ اس سلسلہ کی بعض نئے حقائق کو اہل علم کے سامنے پیش کرتا ہے۔

سعید نفیسی کے اجتہادات پر بھی کبیر صاحب کا بہت دلچسپ عالمانہ اور بے باک انداز سے اس مجموعہ کا نہایت ہی فکر انگیز اردو تبصراتی مضمون ہے، جس میں عربوں سے ان کی نفرت اور عرب مخالف تحریکوں سے متعلق ان کی آراء درج ہیں۔

۱۹۸۹ء میں جائسی صاحب کی ایک اور اہم کتاب ''سویتی: تاجیکی ادبیات کے بانی'' شائع ہوئی، یہ وہی کتاب ہے جس کے ایک مقالے (ابوالقاسم لاہوتی) پر جائسی صاحب کو ۱۹۸۶ء میں نقوش ایوارڈ (لاہور) ملا تھا۔ اردو زبان میں یہ کتاب یقیناً پہلی کوشش ہے جو فارسی ادب کے ایک ایسے گوشے سے بحث کرتی ہے، جس کو ابھی تک سنجیدگی کے ساتھ فارسی زبان وادب کے دائرے میں شامل کرنا قابل قبول نہیں سمجھا گیا، اس سلسلہ میں اس پر کام کرنے کا تو سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں تاجکستان کا جغرافیہ اور تاجیک قوم کی اصل پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرے باب میں سویتی تاجیکی ادبیات کے معمار اول صدرالدین عینی کی حیات، ان کے عہد اور ان کی شاعرانہ کوششوں سے متعلق ہے، تیسرے باب میں ابوالقاسم لاہوتی کی حیات، شاعری اور ان کے عہد سے بحث کی گئی ہے، جنہوں نے عینی کے ساتھ سویتی تاجیکی ادب کی ترویج وترقی میں اپنی زندگی صرف کی ہے، اس کتاب کے شائع ہوجانے پر ''سویت لینڈ نہرو'' ایوارڈ مصنف کو ملا تھا۔

۱۹۹۰ء میں جدید تاجیکی شعراء کے نام سے کبیر صاحب کی ایک اور کتاب شائع ہوئی، اس کتاب میں ان چھ تاجیکی شعراء کے حالات اور ان کی شاعری کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے جو انقلاب بخارا (۱۹۲۰ء) سے قبل پیدا ہوئے لیکن ان کی شاعری کی شہرت انقلاب بخارا کے بعد ہوئی، بقول جائسی صاحب ''..... ماوراء النہر کا علاقہ فارسی زبان وادب کا عہد اولین ہے، یہاں معرض وجود میں آنے والے ادب سے صرف نظر کر کے ایرانی فارسی ادب کا تو مطالعہ کیا جاسکتا ہے، مجموعی فارسی ادب کا نہیں''۔ (مقدمہ جدید تاجیکی شعراء)

بدقسمتی سے ہمارے علاقے میں جدید فارسی ادب کے بارے میں کوئی معلوماتی ذخیرہ سرے سے موجود نہ تھا اور نہ ہی کسی فارسی یا اردو ادیب نے اس پر کوئی کام کیا تھا، یہ دوری محض روسی رسم الخط کی وجہ سے تھی، مزید یہ کہ برصغیر کے ہندو پاک کے علماء بھی بڑی حد تک اس رسم الخط سے واقف نہ تھے۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی کا یہ زبردست احسان ہے کہ انہوں نے روسی رسم الخط سے واقفیت حاصل کر کے تاجیکی شعراء کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی ہیئت پر بھی ناقدانہ نگاہ ڈالی، اردو فارسی زبان وادب کے اس ذخیرے کو ترجمہ کر کے کتابی صورت میں پیش کر دیا تاکہ ہندو پاک کے اہل علم اس تاجیکی ادب سے بخوبی واقف ہوسکیں۔

دو سال بعد ۱۹۹۲ء میں کبیر صاحب کی ایک اور کتاب ''چند ایران شناس'' شائع ہوئی، اس کتاب میں چار ایسے افراد کو موضوع مطالعہ بنایا گیا ہے جن کا تعلق ایران کی سرزمین سے نہیں ہے اور جنہوں نے ایران اور ایرانی قوم کو فارسی ادب کے ذریعہ جاننے اور اپنے اہل وطن سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے، ان فضلاء میں سب سے پہلا نام احمد آتش کا آتا ہے، جن کا تعلق ترکی سے ہے، دوسرا نام الے ساندرو بوزانی (*Ealy Saandrow Boozani*) جو اٹلی کے انتہائی معروف ایران شناس تھے اور جن کا

ماضی قریب میں انتقال ہوا، تیسرا نام میخائل زند کا ہے جو اصلاً پولینڈ کے رہنے والے تھے، ان کے والد ترک وطن کر کے روس کو اپنا وطن بنایا، اس لیے یہ بھی روسی کہلائے، بعد میں وہ اسرائیل منتقل ہوئے اور ہیبریوں یونیورسٹی یوروشلم میں ہی ایرانیات کے استاد ہوگئے اور چوتھے پروفیسر پرژی پیچکا ہیں جن کا تعلق چیکوسلواکیہ سے ہے، یہ وہی پرژی پیچکا ہیں جن کی کتاب کا ترجمہ تاریخ ادبیات تاجیکستان کے نام سے لکھا گیا ہے۔

جائسی صاحب نے ان چاروں کے حالاتِ زندگی ایران اور فارسی زبان سے ان کی رغبت اور تعلق فارسی زبان وادب کی تحصیل اور اس زبان وادب کی خدمت کے لیے جو کوششیں کیں اور کارنامے انجام دیے ہیں انہیں موضوع بحث بنا کر اردو داں طبقہ خاص طور پر ایران شناسی کے شائقین کے لیے ایک علمی تحفہ پیش کیا ہے۔

پروفیسر موصوف کی ایک اور علمی کتاب ''ایرانی تصوف'' ۱۹۹۳ء میں ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ سے شائع ہوئی، ۱۹۹۶ء میں ان کی تالیف ''مثنوی ناہید واختر'' منظر عام پر آئی جو محمد شاہ کے برادر خرد شہزادہ مبارک اختر اچھے میاں کی تصنیف ہے، جائسی صاحب نے مثنوی کا اصل متن مع ایک مبسوط مقدمہ کے شائع کرایا ہے جو فارسی زبان میں لکھا گیا ہے، جس میں مصنف نے اچھے میاں کی سوانح کا جائزہ لینے کے بعد مثنوی کا تاریخی تجزیہ کیا اور اس کو بڑی دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔

فارسی زبان و ادب کے تعلق سے ان کی ایک اہم تصنیف ''ذبیح اللہ صفا حیات اور کارنامے'' (۱۹۸۳ء، ترقی اردو بورڈ، دہلی) ہے، پروفیسر صاحب نے اس تصنیف کے ذریعہ دور حاضر کے ایک مشہور ایرانی مورخ، ادب ناقد، محقق اور انشاء پرداز سے اہل ہندو پاک کو روشناس کرایا ہے، یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے، پہلا باب نقش حیات ہے جس میں ڈاکٹر صفا کی ابتدائی زندگی سے آخر عمر تک کے حالات وواقعات اور علمی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آخر میں ڈاکٹر صفا کی تصنیفات کی ایک فہرست دے دی ہے، بہتر ہوتا کہ صرف کتابوں کے ناموں پر اکتفانہ کر کے ان کا تعارف کرایا جائے۔

صفا کو اپنے دور کے ممتاز ترین دانشوران کی صحبت اور ان سے استفادہ کی سعادت نصیب ہوئی اور ممتاز دانشوروں سے علمی استفادے نے ڈاکٹر صفا کو وہ علمی فضیلت عطا کی کہ وہ اپنے دور کے اہم ترین دانشور اور محقق بن گئے، ڈاکٹر نذیر احمد کی رائے ہے کہ صفا کی زندگی کے بارے میں جن چیزوں کا خیال رکھنا چاہیے تھا وہ نہیں رکھا جاسکا، ان کی رائے میں صفا کی فطری صلاحیتوں کا اعتراف ان خطوط پر ہونا چاہیے تھا کہ صفا بحیثیت مورخ، صفا بحیثیت محقق، صفا بحیثیت نقاد اور صفا بحیثیت انشاء پرداز، اس لیے کہ صفا کی علمی زندگی کے یہی چار تابناک پہلو ہیں، کتاب کا دوسرا باب صفا کی مشہور تصنیف حماسہ سرائی پر ہے، اس میں کبیر صاحب نے صفا کی علمی صلاحیت کے پرکھنے میں اپنی نقادی اور بصیرت کا بہت اچھا نمونہ پیش کیا ہے، ڈاکٹر صفا نے اس کتاب میں رزمیہ شاعری کی تعریف، اس کی خصوصیات اور تاریخ خصوصاً ایران میں اس صنف کی ابتداء اور ارتقاء پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، جائسی صاحب ان کی اس رائے کو سراہتے ہوئے اس طرح رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر صفا کے اس نقطہ نظر کی وجہ سے ادبیات کا دائرہ کافی وسیع ہوجاتا ہے اور ادبیات صرف ایک فن لطیف ہی نہیں رہ جاتا بلکہ وہ سماجی علوم کی سرحد میں داخل ہوجاتا ہے جس کی مدد سے افراد اور قوموں کی الجھی ہوئی کڑیوں کو نہ صرف سمجھا یا جاسکتا ہے بلکہ اس کی بازیافت بھی کی جاسکتی ہے۔ڈاکٹر صفا نے ادبیات کا مطالعہ اسی نقطہ نظر سے کیا ہے کہ اس کی مدد سے تاریخ تہذیب و تمدن اور معاشرت کی گم شدہ کڑیوں کی بازیافت کر کے ایرانی قوم کے تاریخی سلسلہ کو ادبیات کے ذریعہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں، اس میں شبہ نہیں کہ اپنی اس کوشش میں وہ نہ صرف کامیاب ہیں بلکہ مطالعہ ادب کے ایک مکتب نو کے بانی بھی کہے جاسکتے ہیں''۔(ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، اسلام اور عصر جدید، جولائی ۱۹۹۰ء۔دہلی، ص ۳۶)

یہاں کبیر صاحب صفا کی زبان اوران کے انداز بیان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی نظر شعرالعجم کی جلد چہارم میں مولانا شبلی کے شاہنامہ فردوسی کے تنقیدی مطالعہ کے تحت ان خیالات کی طرف نہ جاسکی جو صفا سے تقریباً ۲۵ سال قبل اسی سلسلے میں ظاہر کیے گئے ہیں۔ جائسی صاحب کی اسی تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ رزمیہ شاعری کی جن خصوصیات کا ذکر صفا صاحب نے اپنی کتاب حماسہ سرائی میں کیا ہے ان کی طرف مولانا شبلی نعمانی نے شعرالعجم میں مدتوں پہلے اشارہ کیا ہے، بلکہ اس موضوع پر تفصیلی بحث بھی کی ہے، شاہنامہ پر تفصیلی ریویو کے ذیل میں جو امور زیر بحث آئے ہیں ان میں شاہنامہ کی تاریخی حیثیت شاہنامہ ایران کا ایک جامع انسائیکلو پیڈیا ہے، تہذیب، تمدن، فن جنگ، ضمنی اور مفید معلومات، شاہنامہ اور کیرکٹر، حکمت و اخلاق، موعظت و سعادت، آزادی رائے، عورتوں کی قدر و منزلت شاہنامہ اور مذہب شاہنامہ اور فن بلاغت جذبات تمام وہ چیزیں شامل ہیں جن کا اجمالی ذکر صفا نے حماسہ سرائی میں کیا ہے۔

ان موضوعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ رزمیہ شاعری میں جن خصوصیات کے ساتھ ذبیح اللہ صفا بحث کر رہے ہیں تقریباً ان میں سے ہر ایک پر ان سے زیادہ تفصیل مدتوں پہلے ہندوستان کا ایک ادبی مورخ شبلی روشنی ڈال چکا ہے، اہل ایران بعض وجوہ سے عربوں اور ترکوں سے دلی نفرت رکھتے تھے۔ صفا صاحب کو عربوں کے مقابلہ میں ترکوں سے زیادہ مخاصمت معلوم ہوتی ہے، چنانچہ محمود غزنوی وغیرہ کے ذریعہ ترکوں کے اقتدار آنے پر صفا صاحب کے دل میں جو جذبہ منافرت پیدا ہوا، اس کے بیان میں وہ حد سے تجاوز کر گئے ہیں۔

کبیر صاحب نے اس صورت حال پر نہایت خوبی سے اظہار خیال کیا ہے اور اپنی علمی بصیرت اور ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔

اس کتاب کا تیسرا اور آخری باب ڈاکٹر صفا کی مشہور کتاب تاریخ ادبیات در ایران ہے، کبیر صاحب اس ضخیم کتاب کا جتنا غائر اور دقیق مطالعہ کر کے اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے وہ ان کی ناقدانہ صلاحیت اور علمی بصیرت کا عکاس ہے۔

صفا صاحب نے تاریخ نویسی کا پہلا اصول یہ قرار دیا ہے کہ ہر دور کے ادبی صورت حال کے مطالعہ سے قبل اس عہد کے فکری ماحول، خیالات عقائد اور علوم کا جائزہ لیا جائے، دوسرا اصول یہ ہے کہ اس عہد کے فکر آثار کو سامنے رکھ کر اس عہد کے ماحول کی روشنی میں اس دور کے ادبی قدر و قیمت معلوم کی جائے، عقائد و افکار اور انسانی جذبات کے مطالعہ اور محرکات کی نشاندہی کے بعد ہر دور کے مشہور و معروف اور نمائندہ شعراء، مصنّفین کے کلام کا انفرادی مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

پروفیسر کبیر احمد جائسی نے ان اصولوں کی تنقید بڑی مہارت اور ہوشیاری سے کی ہے، ان کی رائے میں صفا صاحب کی کتاب پہلے اصول کے اعتبار سے نہایت کامیاب کوشش ہے، جس پر فی الحال اضافہ ممکن نہیں البتہ دوسرے اصول پر وہ پوری طرح کاربند نہیں ہو سکے، جائسی صاحب نے فردوسی اور مجیر بیلقانی کے کلام اور اس پر صفا صاحب کی تحریر بطور دلیل پیش کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''شاہنامہ ایران کی بحث کئی اعتبار سے ادھوری ہے، اپنے کام کو شروع کرتے وقت انہوں نے جو مطمح نظر سامنے رکھی تھی ،شعراء ادباء کے انفرادی مطالعہ کے وقت وہ اس مطمح نظر کے پابند نہیں رہ جاتے اور اس کے اکثر تقاضوں کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں، فردوسی کا مطالعہ کرتے وقت معاشرہ اور فرد کے رابطہ کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں.....فردوسی کے عہد کی سیاسی، اجتماعی اور مذہبی کشاکش نے فردوسی کی شاعری کو کس حد تک اور کس طرح متاثر کیا ہے، ڈاکٹر صفا کے مطالعہ میں اس ذہنی کیفیت، بے چینی اور بے اطمینانی کا بھی کوئی ذکر نہیں ملتا جس سے ہر تخلیقی فنکار دوچار ہوتا ہے''۔ (مقدمہ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا-حیات اور کارنامے)

صفا دیگر ایرانیوں کی طرح ہندوستانی محققین کو کوئی وقعت نہیں دیتے، انہوں نے نہ شبلی کی شعرالعجم کو اپنے مآخذ میں شامل

کیا ہے نہ شیرانی کی تحقیقات سے استفادہ کا اعتراف کیا ہے، اگر چہ اکثر جگہوں پر نتائج وہی پیش کیے ہیں جو ان سے پہلے شیرانی نے اپنی تحقیقات کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کیے تھے، یوسف زلیخا کی فردوسی کی طرف نسبت کے بارے میں جو نتائج صفا نے تاریخ ادبیات میں پیش کیے ہیں وہ فردوسی کے چہار مقالے میں برسوں پہلے پیش کیے جا چکے ہیں لیکن اس کے ذکر کا نہ حوالہ دیا گیا ہے نہ اس سے استفادہ کا اعتراف کیا گیا ہے، یہ اور اسی طرح بہت سی کمیاں تاریخ ادبیات در ایران میں پائی جاتی ہیں، لیکن اتنے بڑے ادبی کام میں اس طرح کی چند غلطیاں کا راہ پا جانا نا قابل اعتنا نہیں ہے، صفا کی یہ عالمانہ تصنیف باوجود اپنی جزوی خامیوں کے نہایت مفید اور عالمانہ تصنیف ہے۔

فارسی زبان وادب کے سرمایہ ادب میں تمام علوم وفنون کے بارے میں بیش قیمت معلومات موجود ہیں، یہ آج متمدن دنیا کے علوم وفنون سمجھے جاتے ہیں، مثلاً طبعیات، کیمیاء، ریاضی، ہندسے، الجبرا، تاریخ، جغرافیہ، موسیقی، نقاشی، مصوری، طب و جراحی اور اس طرح کے دوسرے بہت سے علوم کی ترویج میں فارسی زبان کا جو حصہ رہا ہے عام طور سے دوسرے لوگ اس سے ناواقف ہیں، خصوصاً دینی علوم مثلاً قرأت، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اصول تفسیر، علوم القرآن، اسماء الرجال اور علم الکلام وغیرہ۔

پروفیسر کبیر احمد جائسی آزادی ہند کے پہلے اہل علم ہیں، جنہوں نے اس میدان میں قدم رکھا ہے، انہوں نے فارسی تفسیروں کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا ہے، اہم ایرانی تفسیروں اور ان کے مفسرین کا تنقیدی مطالعہ کا سلسلہ شروع کیا، اس سلسلہ میں اب تک ان کی کوششوں کی تین جلدیں ہندو پاک سے شائع ہو چکی ہیں، ان کا پروگرام اس سلسلہ کو چار جلدوں میں مکمل کرنے کا تھا، جائسی صاحب کی یہ کوشش لائق تحسین وتقلید ہے، انتہائی عزم اور پتے ماری کا کام ہے۔

کبیر صاحب کو اس کام کی اہمیت کا بھی اندازہ تھا اور دشواریوں کا بھی، وہ لکھتے ہیں:

اسلام کے زیر نگیں آنے کے بعد ایران میں جو سب سے پہلا علم ایرانیوں کی توجہ کا مرکز بنا وہ علم قرأت تھا، اس کے بعد ایرانی علماء وفضلاء تفسیر نویسی کی طرف متوجہ ہوئے، ابتداء میں ان کی کاوش عربی تک محدود تھیں، لیکن ایران سے عربوں کا غلبہ ختم ہو گیا۔ اور ایرانی حکومت کے قائم ہو جانے کے بعد فارسی زبان میں تفسیر کی ضرورت محسوس کی جانے لگی، چنانچہ ایرانیوں نے ان کی طرف توجہ کی اور دیکھتے ہی دیکھتے چند صدیوں میں اتنا تفسیری سرمایہ جمع کر دیا کہ اس کی نظیر دنیا کی کسی زبان میں ملنی مشکل ہے۔ (ایران کی چند اہم فارسی تفسیریں، جلد اول ۲۰۰۰ء، اردو بازار، کراچی، حرف آغاز: ص ۲۳)

افسوس کہ ایران کا کل تفسیری سرمایہ زمانہ کی دسترس سے محفوظ نہ رہ سکا، کچھ تفسیریں وہ ہیں جن کا نام صرف تاریخوں میں ملتا ہے، مگر ان کے متن کا ایک صفحہ بھی دستیاب نہیں، کچھ تفسیروں کے صرف اجزاء باقی ہیں، اس طرح کہ نہ ان مفسروں کے نام محفوظ رہ سکے اور نہ سن تالیف۔

کبیر صاحب نے ان کے تعارف کے علاوہ ان تفسیروں کا بحسن وخوبی تجزیہ وتحلیل ادا کیا ہے، چنانچہ پہلی جلد میں پانچ قدیم ترین فارسی تفسیریں زیر مطالعہ لائی گئی ہیں:

۱۔ ترجمہ تفسیر طبری ۲۔ بخشش از تفسیر کہن ۳۔ تفسیر قرآن مجید ۴۔ تفسیر قرآن پاک ۵۔ تاج التراجم، یہ پانچویں صدی ہجری تک لکھی جانے والی ایرانی فارسی تفسیریں ہیں، دوسری جلد میں: ۱۔ تفسیر سورآبادی ۲۔ تفسیر نفسی ۳۔ کشف الاسرار وعدۃ الابرار، روض الجنان وروح الجنان فی تفسیر القرآن، تیسری جلد کی تفسیریں ہیں، اکثر پہلی دو تفسیریں پانچویں صدی اور آخری دو چھٹی

صدی ہجری میں لکھی گئی ہیں، جائسی صاحب نے ان تمام تفاسیر کا غائر مطالعہ کیا ہے اور اپنے مطالعہ کا خلاصہ قارئین کتاب کے سامنے پیش کیا ہے۔

جائسی صاحب نے ہر تفسیر کے سلسلے میں پہلے اس کے مصنف کے حالاتِ زمانہ وغیرہ کی خود کی تلاش کی ہے، پھر مؤلفین نے اس کے بارے میں جو اطلاع دی ہیں ان پر سائنٹفک طریقوں سے نظر ڈالی ہے اور اپنے نجی مطالعہ کی روشنی میں خاص موشگافیاں کی ہیں لہٰذا ہر کتاب میں ان کی تحقیقی بصیرت اور عملی پختگی اور نکتہ سنجی کے واضح اشارے ملتے ہیں، خواہش یہ تھی کہ ہر کتاب سے چیدہ چیدہ نتائج اور تحقیقی موشگافیوں کو آپ کے سامنے پیش کرتا لیکن یہ اس قدر محدود وقت اور مختصر مقالے میں ممکن نہ تھا، چنانچہ صرف تفسیر طبری کے ترجمہ اور مطالعہ پر اکتفا کرتا ہوں، ترجمہ تفسیر طبری اب تک کی تحقیق کے مطابق سب سے پہلی فارسی تفسیر ہے، جو محمد بن جریر طبری (۳۱۰ھ) کی مشہور تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن کا فارسی ترجمہ ہے۔

طبری جس طرح درجہ اول کے مورخ تھے اسی طرح درجہ اول کے مفسر قرآن بھی تھے، ان کی مشہور تفسیر کو فارسی کا جامہ پہنانے کا سہرا ان کی مشہور تاریخ کے فارسی ترجمہ کی طرح مشہور سامانی بادشاہ ابوصالح منصور بن نوح سامانی کے سر ہے جو ۳۵۰ھ میں تخت نشین ہوا۔

یہ ترجمہ تاریخ طبری کے ترجمہ کی کسی فرد واحد کی سعی ومحنت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ماوراء النہر کے علماء کی ایک جماعت کو حکومت کی طرف سے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی، چنانچہ مقدمۂ کتاب میں اس سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یوں ہے:

''پس وفاتِ پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم تا آں وقت کہ محمد بن جریر طبری از ایں جہاں بیرون شد اندر سیصد وچہل وپنج بود از ہجرت''۔

(یعنی آنحضرتؐ کے یومِ وصال سے لے کر محمد بن جریر طبری کے اس دنیا کو خیر باد کہنے کے وقت تک جو ۳۴۵ھ میں ہوا۔)

(ایران کی چند اہم فارسی تفسیریں، جلد اول، ص ۳۳)

تحقیق کی رو سے سخت دشواری کا حامل ہے، طبری کا سال وصال تمام تحقیق نگاروں اور مورخین کے قول کے مطابق ۳۱۰ھ ہے، یہ ۳۴۵ھ کیسے ہوگیا، جائسی صاحب اپنے موقف پر ڈٹ گئے اور ہمت نہیں ہارے، انہوں نے اس گتھی کو سلجھانے کے لیے چند باتوں پر غور کرنا طے کیا:

☆ تفسیر طبری کے ترجمہ کا کام ابوصالح بن نوح کے حکم سے عمل میں آیا۔

☆ ابوصالح منصور بن نوح ۳۵۰ھ میں تخت نشین ہوا۔

☆ ۱۶ سال حکومت کرنے کے بعد ابوصالح منصور کی ۳۶۵ھ میں وفات ہوئی۔

☆ ابوصالح کی تخت نشینی یعنی ۳۵۰ھ سے پہلے کسی بھی شخص کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ تفسیر طبری کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا جائے۔

☆ جب یہ مقدمہ لکھا جارہا تھا اس وقت طبری کے انتقال کو زیادہ سے زیادہ پچاس سال گزرے ہوں گے۔

طبری کے وفات کے اس قدر قریب زمانہ میں علماء یہ فاش غلطی کس طرح برداشت کرتے کہ طبری کا سال وفات ۳۱۰ھ سے ۳۴۵ھ کردیا جائے، یعنی ان کے زمانہ (زمانہ تحریر مقدمہ) سے محض پندرہ سال پہلے۔ اگر مورخ یہ غلطی کرتا تو اسی زمانے میں یا اس کے بعد کوئی دوسرے مورخ یا محقق اس کی اس غلطی کی طرف متوجہ ہوتا جب کہ اس بارے میں کسی مورخ یا محقق نے اس غلطی کا ذکر تک نہیں کیا۔

پروفیسر نذیر صاحب کے قیاس کے مطابق ''رامپور کا مخطوطہ ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے اور مخطوطہ سے اس کو نقل کیا گیا ہے، وہ خود بھی اغلاط سے پاک نہیں تھا، اس لیے گمان غالب ہے کہ اس جملے کو نقل کرنے میں کاتب سے چوک ہوگئی ہے'' ۔(ایران کی چند اہم فارسی تفسیریں، جلد اول، ص ۳۳)

کبیر صاحب نے کوشش کی ہے کہ اس گتھی کو سلجھایا جائے، انہوں نے تحقیقی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے اس الجھن کا قابل قبول حل نکال لیا ہے، چنانچہ وہ اپنی تحقیق انیق میں لکھتے ہیں:

''اب سوال یہ ہوتا ہے کہ ۳۴۵ھ کو کس خانہ میں رکھا جائے؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہم کو پہلے یہ بات طے کرنی ہوگی کہ منصور بن نوح نے تفسیر طبری کا ترجمہ کس سنہ میں کروایا؟ جیسا کہ معلوم ہے ابوصالح منصور ۳۵۰ھ میں تخت نشین ہوا تھا، اس نے اس ترجمہ کا حکم اپنے تخت نشین ہونے کے بعد ہی دیا ہوگا، علاوہ بریں طبری کے مصدقہ سنہ وفات ۳۱۰ھ میں اگر چہل وپنج (۴۵) کا عدد بڑھا دیا جائے تو ۳۵۵ھ کا عدد برآمد ہوگا، ہمارا محتاط قیاس یہ ہے کہ یہ مقدمہ ۳۵۵ھ میں لکھا گیا ''سیصد اور ہجری '' کے الفاظ بعد کے کاتبوں کے اضافے ہوں گے۔ جن جلدوں میں باایمان بادشاہوں کے حالات لکھے گئے ہیں ان میں ان تمام بادشاہوں کے حالات درج ہوں گے جو ۳۵۵ھ تک تخت نشین ہو چکے ہوں گے کیا عجیب ہے کہ آخر میں خود ابوصالح منصور کے حالات بھی جمع کر دیے گئے ہوں۔ اگر ہمارا یہ قیاس درست ہے تو پھر یہ عام خیال بھی غلط ہو جاتا ہے کہ تفسیر طبری کا ترجمہ، طبری کے انتقال کے چالیس سال بعد ہوا تھا''۔ (ایران کی چند اہم فارسی تفسیریں، جلد اول، ص ۳۴)

درج بالا قیاس کی مدد سے یہ کہا جا سکتا ہے اور یہ قرین قیاس بھی ہے کہ چوں کہ ابوصالح منصور بن نوح ۳۵۰ھ میں تخت نشین ہوا، یہ بات ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے کہ اسی سال تفسیر طبری کی چالیس جلدیں بغداد سے اس کے پاس لائی گئی ہوں اور اسی سال اس نے ان کا مطالعہ کیا ہو اور اسے مفید معلوم ہوئی ہو اور اسی لیے اس نے خیال کیا ہو کہ اس کا فارسی میں ترجمہ کرایا جائے، چنانچہ اس نے علماء کو جمع کر کے یہ مشورہ لیا ہو کہ اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کرانا کیسا ہوگا؟ جب علماء نے اس کی تصدیق کر دی تو پھر ماوراء النہر کے مختلف شہروں کے علماء کو جمع کیا ہو اور ان سے کہا گیا ہو کہ تم اپنے درمیان میں ایسے باصلاحیت علماء کا انتخاب کرو تا کہ وہ اس کتاب کا ترجمہ کریں، اسی سال انہوں نے اپنے علماء کو منتخب کر کے ترجمہ کا کام ان کے سپرد کر دیا ہو اور اسی سال چالیس کی چالیس جلدیں فارسی میں ترجمہ ہو کر ابوصالح منصور بن نوح کے سامنے پیش کر دی گئی ہوں۔

قیاس یہی کہتا ہے کہ ماوراء النہر کے علماء کو جمع کرنے اور ان سے مشورہ کرنے اور پھر اتنی جلدوں کا ترجمہ کرنے میں کچھ

وقت ضرور لگا ہوگا، اصل چالیس جلدوں کو دیکھتے ہوئے پانچ برس کا زمانہ کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتا، اس لیے کبیر صاحب کی رائے ہے کہ ہمارا قیاس ہے کہ ترجمہ وتفسیر طبری کی جلدیں ۳۵۵ھ میں مکمل ہوئی ہوں اور اس کا مقدمہ بھی اسی سال تحریر کیا گیا ہوگا، نسخہ رامپور میں سیصد اور ہجری کے جو الفاظ ہیں وہ اصل مقدمہ نہ ہوں گے بلکہ یہ کسی کاتب کا اضافہ ہوگا، اصل جملہ یوں رہا ہوگا، آنحضرتؐ کے یوم وصال سے لے کر طبری کے انتقال کے ۴۵ سال تک بعد تک کے حالات وواقعات پر مشتمل ہیں، چھ جلدیں ہم نے اور لکھیں، ابوصالح منصور نے اس ترجمہ کے لیے جن علماء کو بلایا تھا ان سب کے نام مقدمہ میں درج نہیں ہیں، ڈاکٹر ذبیح اللہ نے جس مخطوطے کو پیش نظر رکھا ہے اس میں پانچ علماء کے نام درج ہیں، پروفیسر نذیر احمد کے سامنے جو مخطوطے ہیں ان میں سات علماء کے نام ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ابوبکر محمد بن الفضل الامام ۲۔ابوبکر محمد بن اسماعیل فقیہ ۳۔ابوبکر احمد بن حامد الفقیہ
۴۔خلیل احمد بن احمد السجستانی۔ ۵۔ابوجعفر محمد بن علی ۶۔فقیہ الحسن بن علی بندولی (نسخہ رامپور میں مندوست فقیہ)
۷۔فقیہ ابوہیم خالد بن ہانی کے انتخاب کا فرمان ابوصالح منصور بن نوح کے خادم ابوالحسن فائق الخاصہ کے ذریعہ جاری ہوا تھا۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب نے تحقیق وجستجو کے بعد جن علماء اور ابوالحسن فائق الخاصہ کے بارے میں مواد فراہم کر کے اپنے مقالے میں تحریر کیا ہے، جس کا خلاصہ کبیر صاحب نے اپنے مقالے میں قید کر دیا ہے، کاش وہ ان علماء کے بارے میں جو اطلاعات صفا اور نذیر صاحب کے یہاں تھیں اپنے مقالے میں جمع کر دیتے تو زیادہ مفید ہوتا۔

اس کے بعد کبیر صاحب نے تفسیر طبری کے متن کا مطالعہ کیا ہے وہ چھ صفحات میں ہے، اس کے بعد تحریر کیا ہے کہ ان مثالوں سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ ترجمہ تفسیر طبری میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کریم کی آیات کا اس زمانہ کی فارسی زبان میں لفظی ترجمہ کیا جائے۔

اس تفسیر کے آغاز میں سب سے پہلے کلام پاک کی سورتوں، آیتوں، کلموں اور حرفوں کی تعداد کی نشاندہی کی گئی ہے، بعد ازاں سورۂ فاتحہ کا لفظی ترجمہ ہے، پھر تفسیر۔

اس کتاب کی علمی دنیا میں بڑی پذیرائی ہوئی، مثال کے طور پر دو تبصرے کے چند اقتباسات نقل کیے جا رہے ہیں جس سے اندازہ ہو سکے گا، اس کتاب کے بارے میں علمی اور مذہبی حلقے کی کیا رائے ہے، ہندوستان کے مشہور عالم دین مولانا محمد فاروق خان جنہوں نے ہندی زبان میں کلام پاک کا ترجمہ کیا ہے وہ اس کتاب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

اس کتاب کے مطالعہ سے بعض اہم اور قیمتی باتوں کا پتہ چلتا ہے.....

''.....بہر حال لائق مصنف نے جس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، خدا کرے وہ اس کام کو انجام تک پہنچا سکیں تا کہ لوگ فارسی مفسرین کے کارناموں اور ان کی ذہنی خدمات سے واقف ہو سکیں''۔(اردو بک ریویو، مارچ-اپریل ۲۰۰۲ء، دہلی، ص:۳۹-۴۰)

اس تبصرے سے پروفیسر کبیر احمد جائسی کی محنت کا تمام تو نہیں تھوڑا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے، ایسے ہی جلد دوم پر ایک

تبصرے کے اقتباس سے اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

''جناب کبیر احمد جائسی نے چاروں تفاسیر کی اشاعتوں اور ان کے حوالے سے بعض نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ ہر مفسر کے حالاتِ زندگی جس حد تک ممکن تھا بیان کیے ہیں اور اگر مفسر کے تعین میں کوئی غلط فہمی موجود ہے تو اسے رفع کرنے کی کوشش کی ہے نیز تفسیر کا نمونہ پیش کیا ہے''۔ (ماہنامہ نقطہ نظر، پاکستان، اکتوبر ۲۰۱۱ء)

ان تفاسیر میں جائسی صاحب نے کوشش کی ہے کہ تفسیر زیر بحث کے ان اجزاء پر خاص طور سے روشنی ڈالی جائے جن کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ یہ مفسر کا تفرد ہے یا اس موضوع پر مفسر کی رائے دوسروں سے ہٹ کر ہے، اس کے علاوہ انہوں نے مفسروں کے اسلوب فکر اور مسلکوں سے بھی تفسیری بحث کرتے ہوئے ایسے موضوعات پر نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے، جن میں مفسروں میں آپس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں البتہ کئی حضرات نے اپنے اپنے دائرۂ کار میں ناموری حاصل کی، فزکس میں پروفیسر اسرار احمد، کیمسٹری میں پروفیسر صلاح الدین مرحوم، تعلیمات میں پروفیسر علی اختر خاں، ہائی اسکول کرنے کے بعد شبلی کالج کو چھوڑ کر جانے والوں میں پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی اور پروفیسر شمیم جیراج پوری کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ادبیات کے میدان میں پروفیسر کبیر احمد جائسی نے جو ناموری حاصل کی ہے میری رائے میں وہ شبلی کالج کے کسی اولڈ بوائے کے حصے میں نہیں آئی، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ پروفیسر جائسی شبلی کالج سے جو کچھ لے کر گئے تھے اس پر جلا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ بالخصوص پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر نذیر احمد مرحوم نے دی۔

(شبلی کالج کا ایک مایہ ناز فرزند، ڈاکٹر شباب الدین ۲۰۱۰ء، نئی دہلی، ص: ۸تا۹)

ماخذ:

ا۔ جائسی صاحب کے سلسلے میں راقم کو بہت زیادہ جاں فشانی کی ضرورت نہیں پڑی کیوں کہ بذات خود ان سے ایک انٹرویو (۱۰/نومبر ۲۰۱۲ء میں ان کے انتقال سے پہلے) ان کے بارے میں لیا تھا۔ اور رسالہ تحریک دہلی، جون ۱۹۷۸ء، ''شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ میگزین ۲۰۰۲ء تا ۲۰۰۴ء کا مجموعی رسالہ'' اور بزم شبلی، کبیر احمد جائسی نمبر ۲۰۱۳ء۔ ''ماہنامہ زادسفر'' (ممبئی) ایڈیٹر شوکت علی، مارچ ۲۰۰۵ء، علاوہ ازیں پروفیسر کبیر احمد جائسی کے شاگردوں میں سے ایک لائق شاگرد ڈاکٹر شباب الدین صاحب (موجودہ صدر شعبہ اردو، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ) نے اپنی دو کتابوں ''پروفیسر کبیر احمد جائسی کی علمی وادبی خدمات'' (ایجوکیشنل پریس علی گڑھ ۱۹۹۲ء) اور ''شبلی کالج کا مایہ ناز فرزند کبیر احمد جائسی'' (اصیلہ پریس، دہلی ۲۰۱۰ء) میں جائسی صاحب کی سوانح حیات اس طرح تحریر کر دیا ہے کہ اس میں مزید اضافہ کرنا مشکل ہے، جس کا چیدہ چیدہ خلاصہ ہم نے پیش کر دیا ہے۔

☆☆☆

کنیز فاطمہ
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

احوال وآثار اولیائے معروف خلد آباد

چکیدہ: صوفیاء اکرام کی تعلیمات ہر گز کسی خاص فرقہ یا طبقہ کے لئے مخصوص نہیں تھی، ان کی خانقاہیں بلا مذہب و ملت بلا تعصب ونفرت ہر ایک کے لئے مرکز کی حیثیت رکھتی ہیں ان صوفیائے اکرام کی خانقاہیں دین و اخلاقی علم و ادت کا دانش کدہ دکھ درد کے ماروں کے لئے دار لشفاء، انسانیت و مساوات کا گھوارہ اور بے سہارا لوگوں کے لئے پناہ گاہ ہوا کرتی تھیں، ان خانقاہوں میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے ذریعے رشد و ہدایات سے اور ارشاد و تلقین کے ذریعے شکستہ و ناامید دلوں میں نئی زندگی و توانائی اور ایمان کی حرارت پیدا کی جاتی تھی جن بزرگان دین نے صوفیائے عظام کے فرمودات بیان اور ارشاد و تلقین کو تحریری شکل میں لے آئے وہ ملفوظات کہلائے ان صوفیا اکرام کی تعلیمات صرف صرف معاشرہ میں ان و آشتی یکدلی و یکجہتی کے علمبر دار تھے، آج کا انسان دوستی محبت اخوت مروت مہربانی انسانیت بشر دوستی ہمریستی یکدلی یکجہتی جیسے الفاظ سے نابلد ہوتا جارہا ہے۔ اس مختصر مقالہ میں خلد آباد کے چند مشاہیر صوفیاء کرام کے حالات، تصنیف و تالیفات اور رشد و ہدایات سے بحث کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

کلیدی الفاظ: خلد آباد، صوفیاء، تصنیفات، شاعری، ملفوظ

عہد حاضر میں ضرورت ہے ان صوفیا کرام کی بے مثال تعلیمات رشد وہدایت افکار واحساسات کو عام کرنے کی اور ان کا احیا کیا جائے تا کہ آج کے معاشرہ سے ان برائیوں کا خاتمہ ہو اور چہار سو محبت واخوت بھائی چارہ ویکجہتی کا رفرما ہو۔

سرزمین خلد آباد نہ صرف تاریخی اعتبار سے بلکہ مذہبی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ جہاں ایک طرف دکن میں اسلام کو روشناس کرنے والے سینکڑوں صوفیا اور اولیاء اللہؒ اس سرزمین کی تسکین بخش خاک میں آرام فرما ہیں تو دوسری طرف بہادر جنگجو اور انمول جوہر بھی مدفون ہیں۔ ہندوستان کا عظیم شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر بھی اسی سرزمین میں مدفون ہے۔ سلاطین قطب شاہیہ کا آخرین فرماں روان ابوالحسن تانا شاہ بھی یہیں دفن ہے۔ ان کے علاوہ ملک عنبر نظام شاہ بحری اعظم شاہ اور اس کی بیوی معظم شاہ اور اس کی بیوی آصف جاہی سلطنت کے بانی نظام الملک آصف جاہ ان کا بڑا لڑکا ناصر جنگ شہید بھی دفن ہے۔ شہر پناہ اور اس کے گرد ونواح میں چھوٹے بڑے پرنور گنبد اس بات کے گواہ ہیں کہ ان اولیاء اکرام کے تقدس اور پاک باطنی کے کرشموں نے دکن کے عوام کو اپنا معتقد بنالیا تھا۔ انھوں نے دنیائے فانی سے قطع نظر اپنی شہرت نہ چاہی اور تبلیغ اسلام میں مشغول رہے۔ یہی وہ صوفیائے کرام ہیں جنھوں نے اپنی روحانی، عرفانی اور ایمانی قوتوں سے دکن کے عوام کو سرفراز فرمایا۔ ان رہبران انسانیت نے اس حسن وخوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے کہ کفر وضلالت کے غار سے انسانوں کو نکال کر صراط مستقیم کی بلندیوں پر فائز کر دیا جن میں قابل ذکر اولیاء کرام حضرت برہان الدین غریب حضرت منتجب الدین زرزری بخشؒ، حضرت داؤد حسن شیرازی، حضرت سید یوسف

حسینی۔حضرت شیخ رکن الدین کا شانی حضرت شیخ مجد الدین کا شانی حضرت شیخ حماد الدین کا شانی حضرت مولانا فرید الدین آدیب، حضرت شاہ خاکسار، حضرت شاہ جلال ملقب گنج رواں سہروردی، حضرت خواجہ حسین وحضرت خواجہ عمر شیرازی ان مقدس ومحترم ہستیوں کے احوال وآثار ملاحظہ ہوں:

ا)۔حضرت شیخ برہان الدین: حضرت شیخ برہان الدین الملقب بہ غریب ہانسوی قدس سرہ سلطان المشائخ نظام الدین محمد بن احمد البخاری البرونی الدہلوی کے کامل خلفاء اور اولین مریدوں میں سے تھے اور دکن کے صاحب ولایت ہیں۔آپ کی ولادت بسعادت ۶۵۴ھ،۱۲۵۶ء بمقام شہر ہانسی میں ہوئی اور ۶۹۳ھ میں حضرت محبوب الٰہی کے حلقہ ارادت سے مشرف ہوئے۔ سلسلہ نسب آپ کا شجرہ نسب گیارہ واسطوں سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ تک اور شجرہ طریقت اکیس واسطوں سے سرور کائنات افضل الانبیاء محمد رسول تک پہنچتا ہے۔شیخ برہان الدین کو بچپن سے ہی ریاضت اور مجاہدے کی توفیق ملی۔فرماتے تھے کہ میں ۶۔۷سال کا تھا کہ تنہائی میں کلمہ طیبہ کا ورد کیا کرتا تھا۔تیرہ سال کی عمر میں عہد کیا کہ شادی نہ کروں گا۔اللہ کی بندگی اور خدمت حق میں زندگی گذاردوں گا۔اپنے ابتدائی دور میں علم حاصل کیا اور فقہ اور نافع حفظ کر لی تھی۔شروع زمانے سے آخر تک تجرید وتفرید میں زندگی گذاردی تمام عمر اپنی ملکیت میں کوئی چیز نہ تھی اور ۲۵رسال تک فجر کی نماز عشاء کے وضو سے ادا کی ۳۰رسال تک صوم داؤدی رکھے فرماتے تھے کہ اپنے خواجہ حضرت نظام الدین سے بیعت کرنے سے پہلے میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا میں ایک خندق میں گر پڑا ہوں اور کسی طرح باہر نہیں نکل پا رہا ہوں خدمت شیخ نظام الدین نے میری طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور مجھے خندق سے باہر نکال لیا ہے، جب میں شیخ کے غلاموں کے صف میں داخل ہو گیا تو میں نے یہ بشارت بھرا خواب شیخ سے بیان کیا انہوں نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں اسی دن ہاتھ دے دیا تھا۔

برہان الدین غریب اپنے پیرومرشد کے حکم سے دولت آباد روانہ ہوئے اور وہاں اسلام کی تبلیغ کی آپ کی وفات ۷۳۸ھ بروز شنبہ چاشت کے وقت ہوئی۔آپ کا مزار مبارک خلد آباد میں واقع ہے۔آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

ا۔**شمائل الاتقیاء**: یہ ضخیم تصنیف ہے جواب تک فن تصوف میں ایک اہم تصنیف سمجھی جاتی ہے جو چار قسم اور ۹۱ بیانات یعنی ابواب پر مشتمل ہے۔پہلی قسم اصحاب طریقت دوسری قسم ارباب حقیقت تیسری قسم وجود باری تعالیٰ کے اوصاف اور چوتھی قسم بندوں کے فضائل پر ہے۔

یہ کتاب ۷۳۲ہجری سے ۷۳۸ہجری کے درمیان تالیف کی گئی۔اس کتاب تالیف میں فاضل مولف نے حدیث کی نوفقہ کی بیس اور دوسرے مذہبی موضوعات پر سو سے زیادہ کتابوں کے حوالے جات دے کر تصنیف کی ہے۔تصوف کے تمام مسائل اس کتاب میں موجود ہے:

نمونہ شمائل اتقیا:۔فضائل زکوٰۃ زمرہ طریقت وحقیقت وشرائط آن:معنی زکوہ یکے افزودنی مال است کہ دہندہ مال زکوٰۃ را مال افزون شود دوم معنی پاکیزگی است یعنی بزکوۃ دادن مالیادلہا از لوث نمایم پاک گرددواز عقو بہتا سلامت ماند(قال اللہ خدا من اموالھم صدقۃ تطہرہم وتمیز کیھم) زکوٰۃ دادن نعمت نبوت مرانبیارا دعوت وہدایت کردن خلق است سوے حق و بیان احکام او امراونواہی برامتان وزکوہ دادن حق تعالیٰ بہ بندگان از عام وخاص واخص آنکہ ایشانرادر سفراز چہار رکعت بدوگانے گزاردن فرمان داد واز غفاری خود بیامرزدواز رحمانی خویش رحمت کندائے آخرہ۔حقیقت زکوٰۃ دادن گزاردن شکر نعمت است ہم از جنس آن ظاہری و باطنی چون دانشی کہ نعمت الٰہی بیکران است پس شکر ہم بے کران باشد زکوٰۃ متنوعست اغنیارا بدادن مال از دویست دینار پنج دینار و علیمارا تعلیم احکام دینی از مسائل فقہ واحادیث وتفسیر قرآن مرطلاب وجہاں راوزکوٰۃ طریقت اولیا ومشائخ خاص را بہ تعلیم علم سلوک و

تلقین مشغول ظاہر و باطن و ترک دنیا و جاہ کردن و زکوٰۃ عشقی اخص اولیارا باعطا آلا از تصفیہ دل و تجلیہ روح بمریدان صادق بذل نعمت عشق و محبت و سعادت معرفت و قربت مرطالبان مولیٰ و ارشاد دقایق نفی غیر ددوں و ہدایت حقایق اثبات ذات بیچون مولف راست اشعار معلوم باد اہل سلوک و مریدرا............ بےعلم زہد و ورع حقیقت صلالت است۔

۲۔احسن الاقوال: حضرت عماد الدین کاشانی کی تصنیف ہے۔جس میں نہ صرف تاریخ تصوف کا بیش قیمت مواد محفوظ ہے بلکہ حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کی کوئی مفصل سوانح عمری اس ملفوظ سے بے نیاز ہو کر نہیں لکھی جاسکتی۔احسن الاقوال حضرت برہان الدین غریب کے ارشادات و کلمات سے پر ہے۔اس میں دین و دنیا کی فلاح و صلاح کا ذخیرہ بھرا ہے۔انتیس ۲۹ ابواب پر مشتمل ہے جس میں پیران طریقت کی ملاقات اور زیارت کے آداب مجلس اہل اللہ کے طریقے حسن عقائد و معاملات کی روشیں تزکیہ نفس و تہذیب اخلاق کا نمونہ ہیں۔

نمونہ از ملفوظ احسن الاقوال:

قول سیوم متضمہ حسن عقیدہ اصحاب اعتقاد درحق سپر دسائر زنا وحسن عقیدہ خدمت شیخ طیب اللہ قبرہ باحسن الطیب فرمود کہ وقتیے آینہ بروالت مبارک شیخ الاسلام نظام الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز دادند و خدمت شیخ یکموئی سپر درمحاس مبارک خویش بدید کفت الحمد للہ کی موی سیاہ در پایکا شیخ الاسلام فرید الدین قدس العزیز سپر کردیم دیگر مریدی از سپر خود مسواک یافت ہرکاہ کے خواستیے مسواک کند اول وضو ساختی انکاہ مسواک پید ردلت کرفتے ومسواک کردی باز از جہت نماز وضو دیگر دبی حسن عقیدہ مریدی بود۔

۳۔نفاس الانفاس:۔خواجہ رکن الدین دبیر کاشانی کی تصنیف ہے۔نفاس الانفاس ابتدائی رمضان المبارک ۷۳۲ ہجری سے حضرت برہان الدین غریب کی وفات جو صفر ۷۳۸ ہجری واقع ہوئی ختم کیا ہے۔یہ کتاب فوائد الفواد کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ رکن الدین کاشانی کو اپنے مرشد سے بڑی عقیدت تھی۔اس کتاب کے دیباچہ میں مرشد کے لئے کئی القاب استعمال کئے ہیں۔ختم المشائخ والعاشقین ملجاء الا دتا دوالمجتہدین برہان الحق والشرع والدین حجۃ الاسلام والدین زبدۃ الاتقیاء۔زین الاولیاء کاشف اصرار المعانی۔شارح رموز السبع المثانی علم الہدیٰ۔علامت الوریٰ غوث الثقلین............ الخافصیں الجنید فیز مانہ والفضل فی ادانہ الشبلی فی عادتہ والنوری فی زہادتہ کہف الصدق والیقین۔طاز الاقطاب والمحققن محمد محمود المدعو بالغریب بیت۔اس میں تصوف کی تمام تر تعلیمات ہیں۔

نمونہ از ملفوظ نفاس الانفاس:۔حکایت درحضرت رسالت علیہ اسلام والتحیۃ جشی بیامدر درغایت سیاہی وقباحت یاران بخند یدند رسول علیہ السلام اور اسخت تعظیم کردند و نز دیک خود جای دادند چون جشی بازکشت یاران عرضداشت کردند کہ یارسول دووجہ د یدند کہ او را تعظیم کرد ید پیغامبر علیہ السلام فرمود شما عیب ظاہر او دید ید چہ دانید کہ او چہ لطافت داشت یاران پرسیدند چہ بود حضرت رسالت علیہ السلام فرمودند آنہا سفیر و میاں دولب سیاہ بغایت لطیف وزیبا مینمود بعدہ بندگی مخدوم ذکر بالخیر والعادۃ فرمود این بیت برزبان مبارک راندند بیت کر باعیب بخوئی نیکی نہ وربد باشی بدی نکوی نیکی واین حدیث فرمود (اذا الراد اللہ بعبد خیراً أبصرہ بعیوب نفسہ)

رسالہ غریب: رسالہ غریب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے حضرت خواجہ برہان الدین کے نام موسوم ہے۔اس میں وہی تعلیمات لکھی گئی ہے جو کہ خواجہ غریب نے اپنے بزرگان چشت سے پائی تھی۔

غریب الکرامات: حضرت برہان الدین غریب کے کشف و کرامات پر مبنی ہے۔آپ صاحب کشف و کرامات تھے۔

غرائب الکرامات میں آپ کی تمام کرامات کو تفصیل سے بیان کیا گیا۔اس میں کوئی شک نہیں۔اولیاء اللہ اور خاصان خدا کی سب سے بڑی کرامت دراصل ان کے ارشادات تعلیمات اور شب وروز اعمال وافعال ہیں جن سے ہزار ہا قلوب کی تبدیلی ماہیت ہوئی اور کتنے ہی غافلوں کو آگاہی میسر ہوئی۔

ان کے علاوہ حضرت برہان الدین کے ملفوظات خواجہ حماد الدین بن عماد کاشانی کی تصانیف ہے۔
اسرار الطریقت۔۲۔حصول الوصول۔۳۔منافع المسلمین

آپ صاحب دیوان تھے۔ آپ کا ایک دیوان ہے دیوان 'عین الحیات' یہ تینوں بھائیوں نے اپنی عمر کا خاصہ حصہ اپنے پیرومرشد کے ملفوظات تحریر کرنے میں صرف کیا۔ان کی عظمت اور شان وشوکت کا پتہ ان کے تحریر کردہ ملفوظات کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے ملفوظات میں نہ صرف اپنے پیرومرشد برہان الدین غریب کے عادات زبان و بیان رہن سہن، رشد وہدایات کا ہی ذکر نہیں کیا بلکہ اس وقت کی تہذیب وتمدن رسم و رواج عام زبان و بیان اولیاء کرام خاص کر کے نظام الدین بابا فرید الدین گنج شکر وغیرہ کا ذکر نہایت ہی عزت واحترام سے کیا ہے اور ان کی زبان و بیان کو بھی ضبط تحریر کیا ہے۔

مرات المحققین: کافی مختصر رسالہ ہے۔نہ ہی اس رسالے میں شریعت کی باتیں ہیں نہ ہی طریقت کا ذکر۔ترک دنیا ہے اور نہ محفل سماع کا غلبہ بلکہ حضرت نے اس رسالے میں دین و دنیا کا وجود اور عدم اور مخلوق کا وجود عقل کا وجود کس طرح ہوا نہایت سلیس انداز میں احادیث شریفین اور آیات قرآنی کے ذریعہ مستند طور پر ثبوت کے ساتھ واضح کیا ہے۔

حضرت شیخ منتجیب الدین: **حضرت شیخ منتجیب الدین الملقب زرزری زربخش** معروف بہ دولھا آپ کی ولادت باسعادت ۷۶۵ھ میں ہوئی۔آپ کے والد بزرگوار کا نام حضرت شیخ محمد ہانسوی اور والدہ کا نام بی بی حاجرہ تھا۔آپ شیخ برہان الدین غریب کے چھوٹے بھائی تھے اور شیخ فرید الدین گنج شکر کے مرید تھے۔انھوں نے سب سے پہلے دیوگیر میں سکونت اختیار کی۔ انکے پاس ہر صبح وشام اور دن رات میں غیب سے سونے کی تھیلی آتی تھی جسے وہ خیرات وصدقات میں خرچ کر دیتے تھے۔اس لئے ان کا نام زرزری زربخش ہوا۔جب انھوں نے مجاہدہ وریاضت کو حد کمال تک پہنچا دیا اور محبوبی کے مرتبے تک رسائی ہوگی تو ان کے لئے صبح وشام دو زریں خلعتیں غیب سے نازل ہونے لگیں۔جنھیں وہ فقراء کے مصارف میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔خود استعمال نہ کرتے تھے۔اس لئے اس نام سے مشہور ہوئے۔

موسوی جرأت کا کہنا ہے۔

آن جوان مردے کہ در راہ خدا　　زر بمحتاجان رساند زرزری است

آپ کی وفات ۷ ربیع الاول ۷۰۹ھ کو ہوئی آپ کا مزار خلد آباد میں ہے۔

تصانیف: حضرت شیخ منتجب الدین زرزری زربخش کی تصانیف سے چھوٹے چھوٹے رسالے تصوف میں ہیں جن میں رسالہ زرزری زربخش مشہور ہے۔ان تصانیف میں آپ نے علم تصوف شعریت طریقت عبادات اعمال اور نجات وغیرہ پر بحث کی ہے۔

حضرت سید داؤد حسین شیرازی: **حضرت سید داؤد حسین عرف شیخ زین الدین شیرازی المعروف بائیس خواجہ نام ونسب:۔** سید داؤد حسین آپ کا نام ہے اور شیخ زین الدین لقب بہ نسبت نام آپ خاص وعام میں لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔آپ خواجہ حسین بن نمود شیرازی کے صاحبزادے ہیں۔آپ کی ولادت باسعادت ۷۰۱ ہجری میں بمقام شیراز واقع ہوئی آپ ابھی سات سال کے ہی تھے کہ والدہ ماجدہ انتقال کر گئیں اور والد بزرگوار نے آپ کی پرورش کی وتعلیم دی۔والد ماجد سے کتب صرف ونحو وغیرہ ختم کر کے

نوعمری ہی میں ہمراہ والد کے زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے پھر وہاں سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوکر دارالسلطنت دہلی میں وارد ہوئے۔ دہلی کے جید علماء خصوصاً مولانا کمال الدین سامانہ وغیرہ سے علوم حاصل کیا اور کمال فضیلت کے اعلیٰ مدارج پر پہنچے۔ جب سلطان عمر تغلق نے اہل دہلی کو دولت آباد روانہ کیا۔ شیخ زین بھی دولت آباد تشریف لے آئے۔ آپ علماء کے لباس میں رہتے اور اپنا۔ بیشتر وقت علوم کا درس دینے اور حی و قیوم کی عبادت میں بسر کرتے زہد وتقویٰ میں بہت جدوجہد اور کوشش کرتے تھے۔ آپ حضرت برہان الدین غریب کی رحلت سے تین دن کے بعد سجادہ خلافت پر جلوہ افروز ہوئے اور پیر کے طریقے پر مجرد زندگی بسر کرتے رہے۔ آپ کی وفات 13 ربیع الاول 771 ہجری روز دوشنبہ ہوئی۔ آپ کا مزار مبارک روضہ خلد آباد میں ہے۔

آپ کی تصانیف میں:

۱۔ ہدایت القلوب
۲۔ دلیل السالکین

ہدایت القلوب: ہدایت القلوب خواجہ زین الدین شیرازی کے ملفوظات سے پر ہے جسے امیر حسن مولف جوان کے مرید خاص گزرے ہیں۔ انھوں نے حوالہ قلم کیا جس کی ابتداء ۷ ماہ رجب ۷۴۵ ہجری ۲۵ نومبر ۱۳۴۴ میں ہوئی۔ یہیں سے کتاب کی پہلی مجلس کی ابتداء بھی ہوئی۔ ملفوظ ہدایت القلوب کی تاریخی اہمیت بھی اس میں مسلم ہے کہ اس میں نہ صرف دین و دنیا کی باتیں ہیں بلکہ ہمیں اس دور کی تہذیبی وتمدنی ومعاشرتی نظام کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

دلیل السالکین و ہدایت العاشقین: میر حسن کی تصنیف ہے اس بیش بہا تصنیف میں حضرت خواجہ زین الدین شیرازی کے خاندان عالی کے آداب تہذیب اور روشن طریقت کا بھی ذکر کیا ہے اس کتاب کی دوسری جلد ''**جہت القلوب من مقال المحبوب**'' کے نام سے موسوم ہے اور یہ دونوں کتابیں خواجہ زین شیرازی کی نظر مبارکہ سے گذر کر شرف قبولیت حاصل کر چکی ہیں اس ملفوظ کا آغاز ۷ ماہ رجب المرجب ۷۵۵ھ ۱۳۵۵ء سے ہوا اس کتاب میں جملہ پچیس مجالسوں کا بیان ہے اور اس کتاب کو پچیس ابواب میں تقسیم کیا گیا جن کو فوائد ملاقات کے عنوان سے ترتیب دیا ہے۔

حضرت سید یوسف حسینی المعروف بہ شاہ راجو قتالؒ: آپ کا نام حضرت یوسف حسینی ہے اور عام طور پر شاہ راجو قتال کے نام سے مشہور ہیں اور حضرت سید محمود بندہ نواز المعروف گیسو دراز حسینیؒ کے والد بزرگوار ہیں حضرت سید یوسف حسینی اور ان کے والد حضرت سید شاہ علی حسینیؒ دونوں حضرات سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کے مرید تھے۔

شجرہ نسب آپ کا سلسلہ نسب زید شہید سے ہوکر امیر المؤمنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے آپ مشاہیر اولیا اور صوفیا نہ زندگی رکھتے تھے ویسے ہی عالم بہ عمل صاحب زہد وتقویٰ ریاضت ومجاہدہ میں مشہور تھے۔ آپ ظاہری علوم فقہ حدیث تفسیر میں بڑے ماہر تھے۔ جب دہلی عمائدین فضلاء علماء اور بزرگان عظام کو وہاں منتقل ہونے کا حکم دیا، اس سلسلے میں آپ بھی مع اپنے اہل و عیال کے ساتھ ۲۰ رمضان المبارک ۷۲۵ ہجری سے روانہ ہوکر ۱۷ محرم الحرام ۷۲۸ ہجری میں دولت آباد پہنچے۔ آپ شاعر بھی تھے اپنا تخلص راجا فرماتے تھے، اردو و فارسی میں نصیحت آمیز شعر فرماتے تھے۔ آپ کی وفات ۵ شوال ۷۳۱ ہجری کو ہوئی آپ کا مزار مبارک حضرت شیخ منتجب الدین زرزری بخش کے جانب گنبد بنا ہوا ہے۔

آپ کی تصانیف:

۱۔ تحفۃ النصائح
۲۔ دیوان راجا

۳۔مثنوی راجا

آپ کی تصانیف میں تحفۃ النصائح جو آپ نے اپنے فرزند ارجمند حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے لئے مرتب فرمائی جو فارسی اشعار میں نصیحت اور حکمت کا ایک خزانہ ہے کتاب مختلف عنوانات پر ہے ۴۵/ابواب میں تقسیم ہے، جس میں اوقات نماز کی پابندی اذان کے آداب وغیرہ کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

نمونہ از تحفۃ النصائح:۔

باب سوم در بیان عقاید وعقوبت گور

در گور پرسش حق بدان بر کود کان ہم بالغان — منکر نکیری پرسدش از وی چو غائب شد بشر
مؤمن کہ باشد پار سابدہد جواب زود شان — گویند او را خسپ تو ہمچون عروسی شا دور
عصاۃ بعض مؤمنان گویند جواب از فضل رب — کفار را بستہ زبان دایم عذاب بیشتر

دیوان راجا مثنوی راجا۔ ایکی مشہور مثنوی ہے دیوان راجا میں اپنے فارسی میں نصیحت آمیز شعر فرماتے تھے دیوان راجا کے پانچ قلمی نسخے ہیں۔ ذیل کے ادبیات اسی دیوان سے ہیں؛

صروئیکہ دہدہ ام من اندر عیان نہ گنجد — از دہم و فہم بیرون صورت در آں نہ گنجد
آن روے محض مطلق بیچون ویسے چگوند — از دہم و فہم بیرون صورت در آن نہ گنجد
اندر کنار جانان اسرار ہا بگفتم — ص جبرئیل با ملائک اندر میان نہ گنجد
پرواز مرغ قدسی جزالامکان بنا بشد — این مرغ لا مکان اندر مکان نہ گنجد
اندر جمال جانان راجا دوام غرق است — از فرح این مراتب اندر جہاں نہ گنجد

نمونہ دیگر

توان نعمئ صوتِ حسن ہم بخشش از حضرت خدا — توزینوالحانکم میخواں حدیث مشتہر
آواز خود جان بشنود قوتش رسد عاشق شود — خواہد ختین جای خود قصہ کند سوی زبر
روزی کند کا ید بردن قالب بگیرد دانش منشن — ابن نوع را تو رقص خوان تا کسی ترا باشد خبر
سری خدا درانی سماع محروم زین نعمت سی — مردان بدانند قیمتش نامرد کی داند قدر
اور سماع باشد ر وا آنکس کہ میرد نفس او — چانی بود زندہ در و ورنہ ترا بہتر حذر
چوں شنوی صوت حسن تحمیہ کن بر حال خود — مجذوب چوں گردی از و پیدا شود حال داگر
تامر ترا قوت بود رقص مکن جان من — منکر میشو این حال را دان قال و قیل بیشتر
مطلق بدان حرست غنا مشو ملاہی بہیچکہ — طبو رد بربط جنگ ونی جملہ حرام است در خبر
در طبل ہم حرمت بدان الاکہ طبلی غاز بیان — دف ہم مزن در ہیچ جا جز در عروسی اے پسر
اندر سماع چون بشنوی کس نعرہ آہی میزند — ہرگز مشو مغرور زان شاید کہ باشد از مکر

سعدی ہند حضرت امیر حسن سجزی دہلوی: خلد آباد کی تاریخ شعر وادب سے پر ہے اور صدیوں سے یہ مقام علم وادب کا بھی گہوارہ رہا ہے یہاں بزرگان دین کے ساتھ ساتھ شعرائے اکرام بھی کثیر تعداد میں خلد آباد آئے، ان ہی میں حضرت امیر حسن سجزی دہلوی جو ایک عظیم المرتبت فارسی گو نامور شاعر اور نثر نگار بھی تھے سلطان محمد بن تغلق کے حسب الحکم آپ کو دہلی چھوڑ کر دولت

آباد جانا پڑا آپ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے خلیفہ حاجز تھے۔اپنے عہد کے علماء وفضلاء اور شعرا میں مقتدر اور ممتاز مانے جاتے تھے آپ کو سلطان المشائخ کے مریدوں میں خاص مقام حاصل تھا اور حسن معاملہ صفائے باطن اور تمام اوصاف حمیدہ میں یکتائے زمانہ تھے۔

نام میر حسن یا امیر حسن علاء لقب نجم الدین اور حسن تخلص ہے اس سلسلے میں سب سے زیادہ مستند خود امیر حسن کے تصنیف فوائد الفواد ہے جس میں انہوں نے اپنا نام امیر حسن علاء سجزی لکھا ہے۔

ناکس شمری ہمہ کناں را　　باشد کہ حسن علاء بہاشد

والد کا نام علاء الدین سیتانی المعروف بہ علانی سجزی۔آپ کی ولادت ۶۵۱ ہجری مطابق ۱۲۵۳ء، بمقام بدایون میں ہوئی جس کا شمار ہندوستان کی اسلامی تہذیب کے قدیم ترین مرکزوں میں تھا کم عمری میں آپ کے والد کے نام دہلی آئے، دہلی میں ہی تعلیم وتربیت حاصل کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد امیر حسن نے لشکر میں ملازمت کرلی فوائد الفواد کی ۲۹ر جمادی الآخر ۷۱۳ ہجری کی مجلس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ لشکر میں تلوار کی خدمت کے بجائے قلم کی خدمت ان کے سپرد تھی آپ کی وفات ۷۳۷ ہجری کو ہوئی آپ کا مزار حضرت برہان الدین غریب کے مزار سے جنوب مغرب کی جانب دو کیلومیٹر بیرون شہر واقع ہے۔

فوائد الفواد حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مشتمل ہے جس کو امیر حسن علا سجزی نے جمع کیا ہے اس کتاب چار حصوں میں تقسیم کیا کتاب کل پانچ جلدوں پر مشتمل ہے جن میں ۱۸۸ر مجلسوں کا حال ہے تصوف کے موضوع پر لکھی گئی ضخیم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جو ۳ر شعبان ۷۰۷ ہجری سے پورے ۱۵ر سال یعنی ۱۹ر شعبان ۷۲۲ ہجری تک کی مجالسوں کا حال ہے فوائد الفواد میں حکمت ومعرفت عشق ومحبت مشغولی باطن اور روحانی نعمتوں کے جو اسرار ہیں ان سے صاحبان نسبت تو فائدہ اٹھاتے ہی ہیں لیکن عموماً ہر پڑھنے والے پر شعریت کے رموز واسرار شکارہ ہوتے ہیں امیر خسرو فرماتے ہیں' کاش امیر حسن میری ساری تصنیفات لے لے اوران کے بدلے یہ کتاب مجھ کو دے دے۔

مخ المعانی: تعارف ونمونہ

امیر حسن سجزی سے تصنیف ہے اس کتاب امیر حسن علاء سجزی سے تصوف کے اہم ترین موضوع کو لکھا ہے، مخ المعانی رسالہ جس میں امیر حسن نے عشق عرفان اور تصوف کے جملہ مسائل ہے اس رسالہ میں بڑی ہی خوبی سے بیان کیا مخ المعانی کو حسن سجزی نے جب سلطان المشائخ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے اس کی بڑی تعریف فرمائی اور کلاہ سر سے اتار کر حسن کے سر پر رکھدی۔اس کے علاوہ ایک دیوان ہے اور مثنوی عشق تعارف ونمونہ ہے۔

دیوان کے ابیات

گرچہ از عقل و دل و دیدہو جاں برخیزم　　چیست مطلوب توتا از سر آں بر خیزم
حاش للہ کہ من از شوق فلاں بر خیزم　　وربجاں حکم کنی از سرجاں بر خیزم
یکز ماں پیش من اے جاں جہانم بہ نشیں　　اندریں رستہ دکانیست مرا از طاعت
تابداں خوشدلی از جاں ز جہاں بر خیزم　　گر نہ سودائے تو باشد ز دکاں بہ بر خیزم
ہو سم مسبت کہ پیش تو دمے بنشینم　　یک جہاں طع۳نہ ز تندم کو نشینی بیکار
و ز سر ہر چہ بگوئی پس ازاں بر خیزم　　گر تو دستے بدہی از وہ جہاں بر خیزم
مردمِ دیدہ مرا بہر تو درخوں بنشاند　　بے تو از دنیا و عقبٰی چو نخیزہ چیزے

من برویت نگرم و ز سرجاں بر خیزم
تو بیاتاہم ازیں و ہم ازاں بر خیزم

نتواں تشتم ازاں گو نہ کہ نتوانم خاست
سوئے گورمن اگر بگزری اے سروِ رواں

ورمرادست بگیری تو روں بر خیزم
سرو تو بنگرم از دور و رواں بر خیزم

☆ لعل و لارامم نگر آرا مگاہِ جاں درو
کفرِ سر گیسوشبیں سرمایۂ ایماں درو

حوریست در صورت قمر انجم از و زِیر و زبر
روحیست در ظاہر بشر روحانیاں حیراں درو

در ظلمت زلفش مرورو گرد لعل ناب او
یک سبزہ بیں خضر وش صد چشمۂ حیواں درو

زلف و خط مردم کشش چیں گرفتہ آں جبش
چشم از ہمخونریز تر از غمزہ ترکستاں درو

خود کیست بیچارہ حسؔن تا خون اوریزد کسے
یکمشت خاکست او بلےازیادحاناں جاں درو

☆ اے شمع آشنائی ما چشم روشن از تو
ویرانۂ غریباں گلزار و گلشن از تو

ایدہدہ مردمی کن مہمان کن شوا مشب
برچشم من قدم نہ اے خانہ روشن از تو

تو باغ عاشقانی اے کاش تا قیامت
قمریت کو دمے من طوقے بگردن از تو

اے دوست تا دلم را کدی بکام دشمن
بسیار شکر گفتم بادوست و دشمن از تو

چہ باک اگر زمانہ جاں از تنم برآرد
حقا ذخیرہ دارم صد جاں دریں تن از تو

بر خیز تاکہ ہر دو رقصے کنیم یک جا
من مستم و تو مستی تو از مے و من از تو

جان حسؔن مرنجاں زیر اکہ ہستی اے جاں
تو پاک دامن ازوے او چاک دامن از تو

☆ اے درہمہ روؔم درے یک روئے چورویت نہ
کوئے تو چو فردوست فردوس چو کیت نہ

یوسف شدہ و خوبی بل خوبتر از یوسف
از دیدن او سیری وزدیدن رویت نہ

تنہانہمنم دل را بربستہ ہوئے تو
کو آنکہ بہر موئے دل بستہ بمویت نہ

شوریدگی عالم از خوئے تو شد نے نے
از بےنمسکی بخت است از تلخی خویت نہ

تو چشمۂخورشیدی من زرۂ خورشیدیت
ہر سو کہ روی چشم مدنو کہ بسویت نہ

بگذار حسؔن دعویٰ کز عالم معنی من
رنگسیت نمی بینم چہرنگ کہ بویت نہ

☆ آہ یارا کہ ز ورد و لم آگاہ نۂ
آہ من می شنوی محرم ایں آہ نۂ

ہمچومل محرم مستاں شبانگہ می باش
گرچوگُل مونس مرغان سحر گاہ نۂ

تخت شاہیت کہ بر فیل نہد فرزیں بند
رخ دریں عرصہسند بیدق ایں شاہ نۂ

رخش تسلیمو وصِف صفامی لنگر
مرید میدان توکلت علی اللہ نۂ

سیرسیارہچہ پُرسی ز منجم شب و روز
کہ تو در احسن تقویم کم از ماہ نۂ

منم و باد یہ حیرت و گمراہی چند
تو چناں بارکش اے خواجہ کہ گمراہ نۂ

گفتیم اے حسؔن ایں خرقہ چہ کردی تو کبود
وہ زد ود ے کہ بروں میقد ہم آگاہنۂ

عشق نامہ در بحرہزج مسدس مقصور یا محذوف (مفاعلین مفاعلین مفاعیل یا فعولن) کہ ششصد وشش بیت دارد و در سال ۷۵۵ھ در یک شب ساخفتہ است موضوع این مثنوی داستان عشق جوانی است از ہندوان بہ دفتری و مرگ آن دختر و سوزاندن او بہ مذہب

ہندوان وسوزاندن عاشق خودرابرموافقت معشوق حسن این درستان راکہ درمیان مردم مواخ مودہ بہ نظم کشیدہ است
ابیانی ازعشق نامہ:

محبت لوح بود و عشق خامہ — از آن نامش نہا دم عشق نامہ
نمو دم اند رین چند ین تفکر — سواد یکتبہود این ھمہ در
بہ سال ہفصد این در شد نمودہ — او شنبہ غرّہ زو الحبہ بودہ
جو در نظم آمد این ابیات دلکش — شمر دم حاصل آمد ششصد و شش
نہ از خود کردم این افسانہ منظوم — کہ مشھور است این قصہدرین بوم
اگر گوبی کہ این گفتن چرا بود — بیان عشق بی دینان خطا بود
بیان عشق کا رہر زبان نیست — چو قابل زندہ دل باشد زبان نیست

حواشی:

۱۔روضۃ الاولیا — علامہ غلام علی آزاد بلگرامی، مترجم پروفیسر نثار احمد فاروقی لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس، دہلی۔۱۹۹۴ء
۲۔تاریخ فرشتہ — قاسم ہندوشاہ فرشتہ مطبوعہ سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد
۳۔تحفۃ النصائح — سید یوسف حسینی، شاہ راجو قتال مطبوعہ عماد پریس چھتہ بازار حیدرآباد
۴۔وضۃ الاقطاب — حضرت مولانا رونق علی صاحب لکھنوی خلدآبادی چوتھا ایڈیشن ۲۰۰۰ء سو پرآفسیٹ ٹاون ہال اورنگ آباد
۵۔شمائل الاتقیاء — رکن الدین کاشانی، نسخہ ھای خطی سالا جنگ میوزیم، حیدرآباد
۶۔نفاس الانفاس — رکن الدین کاشانی، مترجم شبیب انور علوی کاکوروی، ۲۰۱۳
۷۔احسن الاقوال — حمادالدین کاشانی، مترجم عبدالمجید، خلدآبادی، ۱۴۳۴ھ م ۲۰۱۳ء
۸۔تاریخ اولیا خلدآباد — مرزا جاوید امان ناشر نثار احمد حاجی برہان بخش عالمگیر پبلی کیشنز، خلدآباد، ۱۹۹۴ء
۹۔دیوان حسن سجزی — عالی جناب راجہ جایان راجہ سرکشن پرشاد بمکتبہ ابراہمیہ مشین، پریس، حیدرآباد دکن طبع ۱۳۵۲ھ

آفرین بانو
ریسرچ اسکالر شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دیوانِ ہلالی کے اہم خطی نسخوں کا تعارف

چکیدہ: مولانا بدر الدین ہلالی کا شمار صف اول کے ان شعراء میں سے ہوتا ہے جنھوں نے تیموری دور کے اواخر اور صفوی دور کے اوائل میں اپنی شاعری کے جلوے بکھیرے۔ ان کی شاعری کی قدر ہر زمانہ میں ہوئی عوام سے لیکر شاہی درباروں تک خوب چرچا رہا۔ تقریباً تذکرہ نگاروں نے ہلالی کو بڑے ہی خوبصورت القاب و آداب کے ساتھ یاد کیا ہے، مقالہ ہذا میں ہلالی استرابادی کے دیوان کے چند مشہور قلمی نسخوں کا تعارف پیش کرنے کی طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے جو مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، رضا لائبریری رامپور، گا یکواڑ لائبریری بنارس ہندو یونیورسٹی جیسے بڑے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

کلیدی الفاظ: ہلالی، شاعری، تذکرہ نگار، کتب خانہ، قلمی نسخے

مولانا بدرالدین ہلالی چغتائی استرآبادی عہدِ تیموری کے آخر اور عہدِ صفوی کے ابتدائی دور سے تعلق رکھنے والے ایک مشہور درخشاں و بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان کا نسب نامہ چغتائی ترکوں سے ملتا ہے لیکن ان کی ولادت استرآباد میں ۸۷۴ھ/۱۴۷۰ء میں ہوئی۔[۱] ہلالی کا پورا نام مولانا ہلالی بدرالدین چغتائی استرآبادی ہے لیکن مآخذ کی بعض کتابوں میں ان کا نام بدرالدین کے بجائے ''نورالدین'' استعمال ہوا ہے لیکن اصلاً شواہد کی بناء پر اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ''بدرالدین'' ہی درست ہے جیسا کہ ''دکتر زہرا خانلری فرھنگ ادبیات فارسی دری'' میں رقم طراز ہے۔ ہلالی ۹۳۶ھ نورالدین ہلالی استرآبادی معروف بہ چغتائی از شاعران غزل سرائی قرن دھم ھجری''[۲] اس شاعر نے اپنا تخلص بھی اپنے نام کی مناسبت سے ''بدری'' رکھا ہے اور اس کا شہرہ خود شاعر کے زمانے میں بھی تھا، کیونکہ قابلیت اور لیاقت کی روشنی ان کے جبین مبارک سے ساطع ہو رہی تھی جسکی بناء پر لوگ انھیں عید کا چاند کہتے تھے۔ تذکرہ ''تحفہ سامی'' میں ہلالی کا تخلص مندرجہ ذیل ابیات سے ظاہر ہوتا ہے۔

روزی کہ فلک نام مرا کرد ھلالی — میخواست کہ من مایل ابروی تو باشم
با ابروی چون ماہ نو ھوش ھلالی رامبر — ما ھلالی ابروی من، عقل مرا شیدا مکن
ای با ابروی تو مایل ھمہ کس چو مہ عید — از ھلالی چہ عجب میل خم ابرویت[۳]

مولانا ہلالی کی نشو نما بھی استرآباد میں ہوئی۔ عنفوان شباب میں جب ہلالی کے اندر نادانی کی جھلک ختم ہوگئی تو وہ استرآباد سے خراسان گئے۔ اس وقت سرزمین خراسان میں عہدِ تیموری کے آخری بادشاہ ذی شعور و ذی علم سلطان ابوالغازی حسین بایقرا تخت نشین تھا ہلالی کو اس کے دربار میں باریابی کا شرف حاصل ہوا اور پھر ہلالی اسی دربار سے وابستہ ہوگئے۔ اس دربار میں امیر علی شیر نوائی جو کہ سلطان حسین بایقرا کا ایک علم پرور وزیر اور دوست تھے اور علم و فضل سے اس کے دربار کو روشن کئے ہوے تھے ہلالی اسی نامور امیر علی کے زیر تربیت میں رہ کر فضل و کمال اور فنِ شاعری کے اکتساب میں ہمہ تن مصروف ہوگئے اور اپنے ہم عصروں پر

برتری حاصل کی۔انھوں نے شعر کے مختلف قسموں میں نہایت بلند پایہ اور مستحکم شعر کہا گویا چاند کی طرح ابتدائی دور کے نقص سے گزرتے ہوے بدرِ کامل کی خوبیوں سے آراستہ ہوگئے۔ ہلالی نے فارسی ادب میں بدرِ کامل کی روشنی کے مانند اپنے کلام کی صورت میں غزل کا دیوان اور تین مثنویاں بطورِ یادگار چھوڑیں۔اس طرح ہلالی نے اپنی حیات کو زندہ جاوید بنادیا۔

لیکن جس طرح بدرِ کامل کو بھی تکمیل کے بعد دوام حاصل نہیں ہے اسی طرح مولانا ہلالی بھی اپنی ابتدائی زندگی میں پوری آب وتاب سے چمکتے ہوے اختتامی مراحل سے بھی دوچار ہوے۔

سلطان حسین بایقرا کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں بدیع الزماں اور ظفر حسین کے پاس سلطنت باقی نہ رہی۔ ہلالی اس عرصے میں حوادث ومشکلات میں گرفتار رہے اور خراسان ایک لمبے عرصے تک دسویں صدی ہجری کے شہنشاہ عبیداللہ خاں ازبک کی دسترس میں رہا۔ پھر اس کے بعد عبیداللہ خاں ازبک نے ہرات کو فتح کیا تو ہلالی نے ازبک کی اس کامیابی کی خوشی میں ایک قصیدہ کہا اس قصیدے کے کچھ شعر ملتے ہیں، مثلاً:

خراسان سینہ روی زمین از بہر آن آمد　　　که جان آمد در او یعنی عبیداللہ خاں آمد
سمند تند زرین نعل خورشید راما ند　　　کہ از مشرق بہ مغرب رفت و یکشب درمیان آمد[۴]

عبیداللہ خاں ازبک نے جب یہ قصیدہ سنا تو تو بہت خوش ہوا اور اسی خوشی میں اس نے ہلالی کو بہت زیادہ نوازشیں کیں اور اسکو خاص درباری بنالیا۔ ہلالی کی اس کامیابی، نوازشیں اور مال ودولت کی وجہ سے درباریوں نے ان پر رشک وحسد کیا اور عبیداللہ خاں سے کہا ہلالی رافضی ہے جس کی بناء پر عبیداللہ خاں نے جو خود ایک متعصب سنی تھا اس کے قتل کا حکم صادر کردیا۔ ہلالی کے قتل سے کچھ وقفہ پہلے ایک خوبصورت اور صاحبِ کمال شخص ہلالی کے پاس کھڑا تھا کہ ہلالی نے اپنی خواہش ظاہر کی میرا قتل اس نوجوان کے ہاتھوں ہو۔مولانا ہلالی کی یہ آخری خواہش پوری ہوئی اور آخر کار اسی نوجوان نے ۹۳۶ھ/۱۵۲۹ء میں ہرات میں ان کا سر قلم کیا، اس طرح ہلالی نے اس دارِفانی کو الوداع کہا۔[۵]

پُرعظیم شاعر مولانا ہلالی نے ایک اہم دیوان بطورِ یادگار چھوڑا جو دیوانِ ہلالی کے نام سے معروف ہے۔ جس میں مثنوی ،قصیدے، قطعات، رباعیات اور متفرقات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ان ے کلام کی تعداد ۲۸۰۰ ہے اس کے علاوہ تین مثنویاں بھی ہیں جو درج ذیل ہیں۔(۱) شاہ ودرویش/ شاہ وگدا (۲) صفات العاشقین اور (۳) لیلیٰ ومجنون کے نام سے ہے۔ جو فارسی شاعری کا شاہکار ہیں۔

مثنوی ''شاہ ودرویش''، بحرِ خفیف (فاعلاتن، مفاعلن اور فعلن) پر ہے جس میں ایک ہزار تین سو پینتالیس اشعار ہیں اس میں ایک فقیر کی شہزادے سے بے ریاں عشق کا بیان ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سحرگاهان که ابر نو بهاران　　　بعشرت خیمه زد کو هساران
بساط کوه شد از لاله گل رنگ　　　بر آمد سیراب از دل سنگ[۶]

''صفات العاشقین'' (بحر ھزج، مفاعلن ور مفاعلن) جو ایک ہزار دو سو پینتیس اشعار پر مشتمل ہے۔اس کا موضوع عرفان واخلاق ہے یہ مثنوی بیس ابواب پر مشتمل ہے۔اس مثنوی کے چند اشعار ذیل میں ہیں۔مثلاً:

یکی را دل گرفتار یکی بود　　　ولی صبرش به غایت اندکی بود
نه در راه طلب از پا نشستی　　　نه با آرام دل یکجا نشستی[۷]

موالانا ہلالی کی تیسری مثنوی لیلیٰ ومجنون ہے۔اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

چشمش زاغی نشستہ بر باغ ابروی سیاہ او پر زاغ
پا کیزہ تنی چو نقرہ ی خام نازک بدنی چو مغز بادام[۸]

ان تینوں مثنویوں میں مولانا ہلالی کی سادگی، روانی اور الفاظ کی بندش ویسے ہی ہے جیسے کی غزلیات میں ہے اور اگر کوئی لطافت ان مذکورہ مثنویوں میں ہے تو وہ صرف الفاظ کی روانی وسادگی سے متعلق ہے نہ کی افکار ومطالب کی تازگی سے۔ان کی غزلیات میں بہت سارے نئے مضامین ملتے ہیں جس کا اندازہ ہم ان کے درج ذیل نمونۂ کلام سے بہ آسانی سے لگا سکتے ہیں۔

در دل بی خبران جز غم عالم نیست درغم عشق تو مارا خبر از عالم نیست
خاک آدم کہ سرشتند غرض تو بود ہر خاک رہ عشق تو نشد آدم نیست

دیوانِ ہلالی کے اہم خطی نسخے جو کہ رامپور رضا لائبریری رامپور، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونورسٹی، علیگڑھ، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ اور بنارس ہندو یونیورسٹی بنارس میں موجود ہیں۔مندرجہ بالا خطی نسخوں کا ذیل میں تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

مخطوطات

(۱) **رامپور رضا لائبریری، رامپور:** رامپور رضا لائبریری میں یہ نسخہ شمارہ ۳۳۶۴ ردیف کتابخانہ:۴۰۶ میں موجود ہے جو ۹۹۳ھ میں لکھا گیا ہے اور یہ نسخہ شاعر کے انتقال کے ۵۷ سال کے بعد لکھا گیا اور قریب العہد ہے۔اسی وجہ سے میں نے اس نسخے کو اپنا اساسی نسخہ بنایا ہے یہ نسخہ خطِ نستعلیق میں ہے اچھی اور صاف ستھری حالت میں ہے کاتب کا نام میر حسین الحسینی ہے۔پورا نسخہ ایک ہی کاتب کی تحریر میں ہے نسخے میں اوراق کی تعداد ۱۰۶ ہے ایک ورق پر ۱۳ سطور ہیں۔اس نسخے کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

ای نورِ خدا در نظر از روی تو مارا تا نکہت جان بخش تو ہمراہ صبا شد
بگذار کہ در روی تو بنیم خد ارا خاصیت عیسیٰ ست دم باد صبا را

درج ذیل متفرقات پر اس نسخے کا خاتمہ ہوتا ہے۔

کہ در پیے آزار دل رنجورے کہ در پیے بیداد من مہجورے
شوخی و بچپن خوشتن مغروریے با عاشق خود ہر چہ کنی مغرورے

(۲) **مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ:** مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں یہ نسخہ شمارہ یونیورسٹی نمبر ۳۱ فارسیہ(۱) نظم کے نام سے موجود ہے۔جو خطِ نستعلیق میں اور صاف ستھری حالت میں ہے کل اوراق کی تعداد ۸۶ ہے اور ہر ورق پر ۷ سطور کی تعداد ۱۱ ہے سالِ کتابت ۱۲۸۵ھ ہے اور نامِ کاتب میر سعادت علی ہے۔اس نسخے کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے۔

ای نورِ خدا در نظر از روی تو مارا بگذار کہ در روی تو بنیم خدارا

اور اس نسخے کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے۔

جملہ مقبول خلق وعالم باد التجا این بہ ذوالمنن کردم

(۳) **مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ:** مولانا آزاد لائبریری میں خطِ نستعلیق میں سلیمان کلکشن نمبر ۳۳/ ۶۹۸ کے تحت ۶۲ اوراق پر مشتمل دیوانِ ہلالی کا نسخہ موجود ہے نسخے کے کاتب کا نام شیو سنگھ برخوردار جیون رام ہیں۔جیسا کہ اس کے ترقیمہ سے ظاہر ہوتا ہے ''۳۸ بیست یکم جمادی الاول تمام شد'' اور نسخے کے ہر ورق پر ۱۸ یا ۱۹ سطر موجود ہیں۔اس کی شروعات درج ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

ای نورِخدادرنظراز روی تو مارا بگذارکہ درروی تو بینیم خدارا

اوراس کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے۔

دل با تو دیدہ از جمالت محروم ای کاش کہ دیدہ ورمقابل بودی

(۴) **مولانا آزادلائبریری علی گڑھ:** مولانا آزادلائبریری علی گڑھ میں خطِ نستعلیق میں یونیورسٹی نمبرفارسیہ(۱)نظم کے تحت ۲۸ورق پر مشتمل دیوانِ ہلالی کانسخہ موجود ہے نسخے کے کاتب کا نام ''بہ گوبند درعہد احمد شاہ'' ہیں۔جیسا کہ اس کے ترقیمے سے ظاہر ہے ''۱۹ذی الحجہ بیست یکم.........المعظم.........بوقت ۳پہر روز دوشنبہ درہندوے باختتام رسد'' نسخے کے ہرورق پر ۱۸یا۱۹سطر ہیں۔نسخے کی شروعات درج ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

ای نورِخدادرنظراز روی تو مارا بگذارکہ درروی تو بینیم خدارا

اس نسخے کا اختتام اس شعر پرہوتا ہے۔

دل با تو دیدہ از جمالت محروم ای کاش کہ دیدہ ورمقابل بودی

(۵) **مولانا آزادلائبریری علی گڑھ:** مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں یہ نسخہ شمارہ ذخیرہ احسن ۷/۱۱۵۵ء۹۸ف دواین موجود ہے۔اسمِ کاتب علی بن میر محمد خدا بخش بن محمد فاضل ہے اور سنِ کتابت ۱۲۵۹ھ تاریخ ہفتم ربیع الاول صورت اختتام بُد برفت۔یہ نسخہ خطِ نستعلیق میں ہے کل اوراق کی تعداد ۶۳ اور سطور کی تعداد ۱۵ ہے اس نسخے کی ابتداء مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

ای نورِخدادرنظراز روی تو مارا بگذارکہ درروی تو بینیم خدارا

اوراس کا اختتام درج ذیل رباعی پرہوتا ہے۔

دور از صنوری نتواند دلِ من زنہار چنان مرو کہ داند دلِ من

آہستہ بروکہ جان ودل ہمرہ بست وصل تو حیات خویش داند دلِ من

(۶) **مولانا آزادلائبریری علی گڑھ:** مولانا آزدلائبریری علی گڑھ میں خطِ نستعلیق میں ضمیمہ نمبر۱/۳۱فارسی ادب کے تحت ۳۳ اوراق پر مشتمل دیوانِ ہلالی کانسخہ موجود ہے۔یہ نسخہ ناقص الآخر ہے نسخے کے ہرورق پر۱۴یا۱۵سطور موجود ہیں۔ سالِ کتابت اور نامِ کاتب نامعلوم ہے۔اس نسخے کی شروعات مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

ای نورِخدادرنظراز روی تو مارا بگذارکہ درروے تو بینیم خدارا

اوراس نسخے کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے

رخ ہرگل رخسارخوبان دوختن جوش دولت است کاش ہرمژگان من چشمی چوسوزن داشتی

(۷) **سالارجنگ میوزیم حیدرآباد:** سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں خطِ نستعلیق میں A./N.m515 کے تحت ۹۲اوراق پر مشتمل دیوانِ ہلالی کانسخہ موجود ہے نسخے میں اوراق پر سطور کی تعداد ۱۱ ہے اس نسخے کا سائز 8.4.cm×137 ہے۔کاتب کا نام عنایت اللہ خاں اور سالِ کتابت ۲۸صفر ۱۸۰۸/۱۲۲۳ ہے۔اس نسخے کے آخر میں عبدالعلی کے نام کی مہر لگی ہے۔نسخے کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے۔

ای نورِخدادرنظراز روی تو مارا بگذارکہ دررو تو بینیم خدارا

اوراس کا اختتام اس شعر پرہوتا ہے۔

یارب تو پری یا ملکی یا بشری یا غیرت آفتاب یا رشک حوری

(۷) **سالار جنگ میوزیم حیدرآباد:** سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد خطِ شکستہ میں A./N.m516 کے تحت ۵۵ اوراق پر مشتمل دیوانِ ہلالی کا نسخہ موجود ہے نسخے کے اوراق پر سطور کی تعداد مختلف ہے نسخے کا سائز 16.2×8.3cm ہے۔ یہ نسخہ ۱۳ ہویں صدی کے شروعات میں لکھا گیا۔ کرم خوردہ بھی ہے کاتب کا نام معلوم نہیں۔ نسخے کی ابتداء مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

ای نورِ خدا درنظر از روی تو مارا بگذار کہ در روی تو بینیم خدارا

نسخے کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے۔

دردا کہ اسیر ننگ ونا میم ھنوز صد بار بسوختیم وفا میم ھنوز

(۸) **سالار جنگ میوزیم حیدرآباد:** سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد میں خطِ نستعلیق میں A./N.m517 کے تحت ۱۸۳ اوراق پر مشتمل دیوانِ ہلالی کا نسخہ موجود ہے اس کے بعض اوراق کرم خوردہ ہیں اس نسخے کا سالِ کتابت ۱۳ ہویں صدی کی شروعات ہے کاتب کا نام معلوم نہیں۔ نسخے کی شروعات اس شعر سے ہوتی ہے۔

ای نورِ خدا درنظر از رویتو مارا بگذار کہ در رویتو بینیم خدارا

اور اس کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے۔

ھلالی میر سد آھم بماہ آسمان ھر شب بیاد آنکہ ماہ مہربانی داشتم روزی

(۹) **بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس:** بنارس ہندو یونیورسٹی بنارس میں یہ نسخہ شمارہ o16,1k37,1 موجود ہے اس کا سائز 93/4×6 ہے۔ سنِ کتابت 8181A.D ہے کاتب کا نام معلوم نہیں۔ کل اوراق کی تعداد ۱۱۱ ہے یہ نسخہ خطِ نستعلیق میں ہے۔ اس نسخے کی ابتداء مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

ای نورِ خدا درنظر از روی تو مارا بگذار کہ در روی تو بینیم خدارا

(۹) **بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس:** بنارس ہندو یونیورسٹی بنارس میں یہ نسخہ شمارہ o164,1k37,1 موجود ہے اس نسخے کا سائز "6×8/2 ہے نام کاتب شنکر لال ہے اور سنِ کتابت 1841A.D ہے۔ کل اوراق کی تعداد ۱۴۸ ہے یہ نسخہ خطِ نستعلیق میں ہے۔ نسخے کی شروعات مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

ای نورِ خدا درنظر از روی تو مارا بگذار کہ در روی تو بینیم خدارا

(۱۰) **بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس:** بنارس ہندو یونیورسٹی بنارس میں یہ نسخہ شمارہ o164,1k37,1 موجود ہے اس نسخے کا سائز "5×7/4 ہے سنِ کتابت 1798A.D ہے کاتب کا نام نامعلوم ہے۔ اس نسخے کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

ای نورِ خدا درنظر از روی تو مارا بگذار کہ در روی تو بینیم خدارا

(۱۱) **خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ:** کتابخانہ خدا بخش، پٹنہ میں خطِ شکستہ میں o16.091k55D کے تحت ۱۳۶ اوراق پر مشتمل دیوانِ ہلالی کا نسخہ موجود ہے نسخے میں اوراق پر سطور کی تعداد مختلف ہے۔ سالِ کتابت A.H1190 ہے اور نامِ کاتب گوکل چند ہے۔ نسخے کا آغاز درج ذیل اشعار سے ہوتا ہے۔

ای نورِ خدا درنظر از روی تو مارا بگذار کہ در روی تو بینیم خدارا
تا نکہت بخش تو ہمراہ صبا شُد خاصیت عیسیٰ ست دم باد صبارا

اور نسخے کا خاتمہ اس رباعی پر ہوتا ہے۔

از بسکہ مرا دولت دیدار کم است گفتن نتوان کہ تاچہ مقدار کم است

رنجست فراقت کہ کمش بسیار ست عیش است وصال تو کہ بسیار کم است

(۱۲) **خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ:** کتابخانہ خدابخش، پٹنہ میں یہ نسخہ شمارہ 016.091.059eA کے نام سے موجود ہے۔ سالِ کتابت اٹھارہویں صدی ہے اس نسخے میں اوراق کی تعداد ۲۱ ہے اوراق پر سطور کی تعداد مختلف ہے یہ نسخہ خطِ شکستہ میں ہے اور کرم خوردہ بھی ہے نسخے میں جابجا اوراق غائب ہیں۔ نسخے کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے۔

ای نورِ خدا در نظر از روی تو مارا بگذار کہ در روی تو بینیم خدارا

اور نسخے کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے۔

ای اجل سوی ھلالی بہر جان بردن میا زانکہ عاشق کاہ مردن جان بجانان میدھد

(۱۳) **خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ:** کتابخانہ خدابخش، پٹنہ میں نستعلیق میں HL-3369 کے تحت ۵۵ اوراق پر مشتمل دیوان ہلالی کا نسخہ موجود ہے۔ ہر ورق پر سطور کی تعداد ۱۵ ہے اس نسخے کا سائز 23.5×17.5;19×9.5 cm ہے سنِ کتابت ۱۲۱۵ھ ہے اسمِ کاتب رحیم بخش ہے اس نسخے کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے۔

ای نورِ خدا در نظر از روی تو مارا بگذار کہ در روی تو بینیم خدارا

(۱۴) **دیوانِ ہلالی، مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ:** ۲۷ فارسیہ (۱) نظم، تعدادِ اوراق ۔۸۵

(۱۵) **دیوانِ ہلالی، مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ:** عبدالسلام نمبر ۸۲۸/۶۵ف (۱۰) نظم، تعدادِ اوراق ۔۵۶

(۱۶) **دیوانِ ہلالی، مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ:** زخیرہ احسن ۵۵۱۱/۱۸ء ۸۹۱ف دواین، تعدادِ اوراق ۔۵۵

(۱۷) **دیوانِ ہلالی، مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ:** یونیورسٹی نمبر ۳۰ فارسیہ (۱) نظم تعدادِ اوراق ۔۳۸

(۱۸) **دیوانِ ہلالی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ:** HL-5491، تعدادِ اوراق ۔۵۴

(۱۹) **دیوانِ ہلالی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ:** HL-6183، تعدادِ اوراق ۔۲۰

(۲۰) **دیوانِ ہلالی، رامپور رضا لائبریری، رامپور:** ۳۳۶۶ ب سنِ کتابت قبل ۱۸۴۱ میلادی، اور کاتب کا نام عہد نواب احمد علی خان بہادر والی رامپور، تعدادِ اوراق ۔۶۳

(۲۱) **دیوانِ ہلالی، رامپور رضا لائبریری، رامپور:** ۳۳۶۵ ب سالِ کتابت ۱۳ جلوس شاہ عالم ۱۱۸۵ھ ہے نامِ کاتب خوشوقت رای ہے تعدادِ اوراق ۔۴۷

حواشی:

(۱) تحفۂ سامی، مصنف۔ سام مرزا صفوی، مطبع۔ پتنہ دارالفنون ۱۹۳۴ میلادی، ص۔۱۱

(۲) فرھنگ ادبیات فارسی دری، دکتر زہرا خانلری، مطبع۔ ایران، ص۔۵۴۳

(۳) تحفۂ سامی، مؤلف۔ سام مرزا صفوی، پتنہ دارالفنون ۱۹۳۴ میلادی، ص۔۱۳

(۴) تاریخ ادبیات در ایران، مؤلف۔ دکتر ذبیح اللہ صفا، مطبع۔ تہران ج۔ چہارم، ص۔۴۳۲

(۵) ایضاً، ص۔۴۳۳

(۶) ایضاً، ص۔۴۳۴

(۷) ایضاً، ص۔۴۳۵

(۸) تاریخ ادبیات ایران، مؤلف۔ پرفسور ادوارد برون، مطبع۔ چاپخانہ روشنائی تہران شمسی گردید، ص۔۱۵۶

ڈاکٹر محمد الطاف بٹ
لکچرر شعبہ اردو و فارسی
گرونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر

فارسی مثنوی کا ارتقاء: ایک مطالعہ

چکیدہ: اتر پردیش کی سرزمین ہمیشہ سے فلسفیوں، مفکروں، دانشوروں، معلّموں، علماء و فضلاء، شعرا اور عرفا و ادبا کا مسکن رہی ہے۔ یہاں کی مٹی نے ایسی عظیم شخصیات پیدا کی ہیں، جو نہ صرف اپنے زمانے میں یکتائے روزگار تھے بلکہ آج بھی ادبی دنیا اُنکا لوہا مانتی ہے۔ پروفیسر عزیز عباس بھی اسی سرزمین اتر پردیش کے ایک سچے اور دیانت دار ادیب ہے، چنانچہ انھوں نے ایک نادر کتاب ''فارسی مثنوی کا ارتقاء'' لکھکر نہ صرف اتر پردیش کی مٹی سے اپنی ادبی وابستگی کا ثبوت دیا ہے بلکہ ہندوستان میں ادب کے اس انحطاطی دور میں جہاں صرف انگریزی اور اردو کا بول بالا ہے ، فارسی کی ایک اہم صنف سخن ''مثنوی'' کی طرف دوبارہ توجہ مرکوز کی ہے۔ اور ایران و ہندوستان میں اس قدیم صنف مثنوی کی ابتداء و ارتقاء پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

کلیدی الفاظ: ''فارسی مثنوی کا ارتقاء'' پروفیسر عزیز عباس کا ایک نادر اور اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ جو ہندوستان میں کلاسکی شاعری پر لکھی جانی والی کتابوں میں مثنوی کی صنف پر ایک اہم کتاب ہے۔

نہ دریا ہر نفس سیلے براند　　نہ صحرا دایماً صحرا بماند
نہ نادان ہرزمان بیہودہ گوید　　نہ دانا ہر دمی گوہر فشاند [۱]

پروفیسر سید عزیز عباس ۱۵/ دسمبر ۱۹۵۷ء میں جارچہ، ضلع گتم بدھ نگر (نوئڈ) اُتر پردیش میں پیدا ہوئے۔[۱] آپ کے والد سید باقر عباس تھے جو اپنے علاقہ کے زمیندار اور مکھیا تھے۔ والدہ محترمہ سیدہ اُم البنین تھی۔ آپکا خاندانی سلسلہ بیہقی سادات سے ملتا ہے۔ جس کی ایک شاخ کشمیر میں بھی موجود ہے۔ انکے جداعلیٰ زین العابدین بڈشاہ کے دربار سے منسلک رہے اور وزیر عظم کے عہدے پر معمور تھے جن کا نام سید حسن بیہقی تھا۔ یہ اپنے چچا سید محمود بیہقی برقع پوش کے ہم راہ سبزوار سے ہجرت کر کے دہلی میں وارد ہوئے۔ بقول مصنف ''بہارستانِ شاہی'' سید محمود بیہقی کا شمار اپنے وقت کے بزرگ صوفیاً میں ہوتا ہے۔ آپ فارسی کے شاعر بھی تھے اور درویش تخلص کرتے تھے۔ بعد میں یہ کشمیر چلے گئے۔ کشمیر سے ہجرت کر کے یوپی کے ایک قصبہ جارچہ (جارچہ) میں تبلیغ کے سلسلے میں قیام پزیر ہوئے۔

پروفیسر عزیز عباس نے ابتدائی تعلیم اپنے وطنجارچہ ہی میں حاصل کی۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے موصوف نے ایم۔اے فارسی کی ڈگری حاصل کی۔ اس یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۹۸۲ء میں گرونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ یہیں سے فارسی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری سے حاصل کی اور بعد میں ایم۔اے اردو بھی کیا۔ ملازمت میں ترقی کرتے ہوئے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور تا حال شعبۂ اردو و فارسی میں بحیثیت صدر شعبہ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر موصوف کی شخصیت مُتنوع اور بڑی اہمیت کی حامل

ہے۔اگر چہ فارسی ادب میں انکی شخصیت کی پہچان بلند مرتبہ استاد کی حیثیت سے ہے لیکن درحقیقت آپ فارسی اور اردو زبان کے بہترین ادیب اور دیانت دار محقق بھی ہیں۔انہیں فارسی و اردو زبان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی کئی زبانوں پر جیسے ہندی، پنجابی وغیرہ پر بھی دسترس حاصل ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی پوری قدرت حاصل ہے۔موصوف نے فارسی زبان وادبیات کی مشعل کو اُس شہر میں جلائے رکھا جہاں فارسی زبان کا کوئی نام لینے کے لئے تیار نہ تھا۔بلکہ پنجابی، ہندی اور انگریزی کا بول بالا تھا،موصوف کی محنت وکاوش سے آج بھی وہاں (امرتسر، پنجاب) فارسی اور اُردو زبان وادبیات کے شعبہ میں درس وتدریس کا عمل جاری وساری ہے۔آپ گورونانک دیو یونیورسٹی میں موبائل ڈکشنری (Mobile Dictionay) کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔

یوں تو پروفیسر عزیز عباس کی بیشتر زندگی درس وتدریس کے اردگرد گھومتی رہی ہے لیکن اپنی انتہائی تدریسی مصروفیت کے باوجود انہوں نے چند کتابیں ایسی لکھی ہیں جو ان کے ادبی مزاج سے دلچسپی کا بین ثبوت ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ ان کا تعلق تنقید سے کم اور تحقیق سے زیادہ رہا ہے۔یہ کتابیں کچھ اس طرح سے ہیں:

۱۔اُردو کی آسان کتاب۔

۲۔او،آر،ڈی،بی،او،جی ڈینش پنجابی، ہندی، اردو ڈکشنری۔

۳۔فارسی مثنوی کا ارتقاء۔

۴۔قصہ ناز و نیاز از شاہ فخر اللہ آفرین لاہوری وغیرہ۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہزار برسوں کی طویل مدت میں تاریخی تقاضہ کے مطابق ہندوستان کا مختلف اقوام وملل سے رابطہ رہا۔نتیجۃً اس روابط کی بنا پر دوسروں کے بہت سے افکار وعقائد کا ہندوستان کے قلم کاروں، محققوں، دانشوروں وغیرہ پر اثر پڑا جس کے زیر اثر ہزاروں کی تعداد میں یہاں پر ایران، ہندوستان اور وسطی ایشیاء کے شعرا، ادباء، حکماء اور علماء پر کتابیں معرض وجود میں آئیں۔اس طرح جب ہم اکیسویں صدی پر اپنی نظر دوڑاتے ہیں تو بہت سے قلم کار آج بھی ایران و ہندوستان کے فارسی شعرا وادباء کے کلام پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔خواہ وہ پروفیسر امیر حسن عابدی، پروفیسر نبی ہادی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر عراق رضا زیدی ہوں یا پھر اس سرزمین ہند سے اٹھنے والا کوئی اور اسکالر ہو۔غرض یہاں کی سرزمین پر کئی ادوار میں یہاں کے محققوں اور دانشوروں نے کسی نہ کسی طرح فارسی زبان وادبیات کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔بقول ڈاکٹر کریم نجفی:

''غور طلب ہے کہ سرزمین ہندوستان نے جس طرح سے ایرانی شعرا، عرفاء، حکما اور جملہ صاحبان فنون کا خیر مقدم کیا اور اپنایا یہ خود اپنے آپ اسلامی تہذیب اور ایرانی ثقافت کی بہت بڑی خدمت ہے'' ۲

زیر بحث مقالہ ''فارسی مثنوی کا ارتقاء'' بھی پروفیسر عزیز عباس کی ایک اہم تحقیقی کارنامہ اور ادبیات فارسی کی بڑی خدمت ہے جو کئی وجوہات کی بنا پر جاذبِ نظر ہے۔جسکا تذکرہ آگے آئے گا۔سب سے پہلی بات تو یہ جاننے کی ہے کہ موصوف اس کتاب کی تالیف کرنے میں کیونکر متوجہ ہوئے۔اس ضمن میں مولف خود کتاب کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''دور حاظر پر نظر ڈالی جائے تو اس تکنیکی دور میں نہ تو کسی کے پاس طویل نظم لکھنے کا وقت ہے اور نہ ہی طوالت کی بنا پر اسے کوئی پڑھنے کا متحمل ہے۔تاہم ضرورت محسوس ہوئی کہ فارسی مثنوی نگاری کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جائے۔

ایک بار استاد محترم جناب پروفیسر نبی ہادی صاحب سے اس بارے میں گفتگو کا موقع ملا تو فرمانے لگے 'میاں یہ کام آپ ہی کیوں نہ کرلیں' حکم کی تعمیل کرتے ہوئے راقم نے اس موضوع سے متعلق مواد جمع کرنا شروع کر دیا'' ۳

اس ضمن میں موصوف نے اپنی تدریسی مصروفیت کے ساتھ ساتھ ملک کے بہت سارے کتّب خانوں سے استفادہ کیا اور اپنی تحقیق کو عام قارئین تک پہنچانے کا جذبہ ہی اِس ضخیم کتاب کے لکھنے کا محرک بنا۔ یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مثنوی کے تعارف، ٹیکنیک اور آغاز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی ایران کے بلند پایہ مثنوی گو شعرا کا بھی وضاحت کے ساتھ تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں ہندوستان میں فارسی مثنوی کا مفصّل ذکر آیا ہے جو طوطی ہند امیر خسرو سے شروع ہوتا ہے اور شاعر مشرق علامہ اقبال کی مثنوی گوئی پر اختتام کو پہنچتا ہے۔

تیسرے اور آخری باب پنجاب اور سندھ میں فارسی مثنوی گوئی پر تاریخی تسلسل کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔

متذکرہ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے اس کتاب میں مثنوی کے ارتقاء پر تاریخی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ بات واضح کی ہے کہ ایرانیوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اگر چہ ادبی روایات عربوں سے مستعار لیں لیکن مثنوی کی صنف عربی ادب سے نہیں بلکہ یہ صنف پہلے سے ایران میں موجود تھی۔ اسی طرح موصوف نے ایک اور اہم تحقیقی بات بیان کی ہے کہ دنیا کے اکثر و بیشتر ادبیات کا آغاز نثر سے ہوتا ہے اس کے برعکس فارسی ادب کی تاریخ نثر کے بجائے نظم سے شروع ہوتی ہے جو نہایت ہی اہم اور تاریخی جملہ ہے۔[۴]

مصنف نے ڈرامہ اور مثنوی کی بنیادی فرق کو بھی واضح کیا ہے۔ چونکہ یونان اور ہندوستان کے ادب میں جو مقصد ڈرامہ یا ناٹک سے پورا ہوتا ہے وہی مقصد ایران کے ادب میں مثنوی کے ذریعے پورا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں مصّنف اپنی بحث یوں آگے بڑھاتے ہیں:

''مثنوی میں فنکار یعنی لکھنے والا قصّہ کی باگ ڈور خود اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ وہ اپنے قلم کے زور سے مثنوی کے کرداروں کو جس طرح چاہتا ہے پیش کرتا ہے۔ ڈرامہ میں دوسری صورت ہوتی ہے۔ وہاں قصّہ مصّنف کے ہاتھ سے نکل کر اسٹیج پر نقل و حرکت کرنے والے کرداروں کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے۔ اگر کردار با سلیقہ اور ذہین نہیں ہیں اور جی لگا کر قصّہ کو پیش نہیں کر پاتے تو ادا کاری کے دوران قصّہ کی جان نکال دیں گے اور مصنّف کی ساری محنت برباد کر دیں گے۔ ڈرامہ کے مصنّف نے کیسا بھی زبردست اور شاہکار فن تخلیق کیا ہو اگر اداکار دوئم درجہ کی صلاحیت رکھتے ہیں تو اس فن کو شاہکار درجہ سے گرا کر دو کوڑی کا کر دیں گے۔ مثنوی میں یہ خطرہ نہیں ہے۔ مثنوی ایک مصنّف کا شاہکار ہے اور ایک ہی قصّہ کو لوگوں کے مجمع میں پیش کرتا ہے۔ یہ بات ضروری ہے کہ مثنوی کے قصّہ گو کو بھی ڈرامہ کے کردار کی طرح چابکدست، ہوشیار اور ذہین ہونا چاہئے''۔[۴]

موصوف نے اس کتاب میں مثنوی کی درجہ بندی پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس صنف کی شاعرانہ ٹکنیک پر بھی روشنی ڈالی ہے جس سے بہت سے ایسے بنیادی امور بحث میں آئے ہیں جن سے واقف ہونا فارسی شاعری کے شائقین کے لئے بے حد ضروری ہے۔ مثال کے طور پر شاعری کی درجہ بندی اور ٹکنیک پر لکھتے ہیں کہ مثنوی کی پانچ قسمیں ہیں۔ ۱۔ عشقیہ مثنوی ۲۔ اخلاقی مثنوی ۳۔ تاریخی مثنوی ۴۔ رزمیہ مثنوی ۵۔ واقعاتی مثنوی۔ ان مختلف الاقسام مثنیوں میں ہر طرح کے مضمون ادا کئے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح علم عروض کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے ملا حسین واعظ کاشفی کی کتاب 'عروض و بلاغت' اور 'المیزان الوافی' کا حوالہ دیتے ہوئے یہ معلومات پیش کی ہے کہ جمہور کے سامنے مثنوی کی سات بحریں ہوتی ہیں۔ جن میں سے دو بحریں ہزج مسدس سے، دو رمل مسدس سے، ایک بحر سریع، ایک بحر خفیف مسدس سے اور ایک بحر متقارب مثمن سے مشتق ہیں۔ اس کے علاوہ مصنف نے شعرا کے ان بحروں میں لکھے ہوئے مثنویات کا بھی اختصار کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔

پروفیسر عزیز عباس نے اس کتاب میں پہلے باب میں مثنوی کے آغاز کے بارے میں ابوشکور بلخی کی مثنوی ''آفرین نامہ'' کو فارسی مثنوی کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے۔اس کے بعد سلسلہ وار یعنی عہد بہ عہد جن عظیم فارسی شعرا نے مثنوی کی صنف کو ایران میں آگے بڑھایا، ان کے بارے میں نہایت جامع اطلاعات فراہم کی ہے۔ساتھ ہی ان مثنویات کے بحروں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ان میں سے چند مشہور مثنویات یوں بحث میں آئے ہیں:

''کلیلہ ودمنہ'' رودکی، یہ مثنوی بحر رمل مسدس مقصور میں، ''شاد بحر وعین الحیات''، ''وامق وعزرا'' اور خنگ بت وسرخ بت'' یہ تینوں مثنویات عنصری بلخی کی ہے۔صاحب کتاب نے عنصری کی مثنوی 'سرخ بت اور خنگ بت کے بارے میں ایک دلچسپ اور تاریخی نکتہ بیان کیا ہے مثلاً جدید افغانستان کے صوبہ بامیان میں وہاں کے باشندوں نے اپنی عقیدت مندی کے جوش میں مہاتما گوتم بدھ کے دو مجسمے پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے تھے۔جو دنیا کے تمام بدھوں کی آج بھی زیارت گاہ ہے اور بامیان میں وہ دونوں مجسمے موجود ہیں۔طالبان نے اپنے چند سالہ دور حکومت میں تمام دنیا کے احتجاج کے باوجود اِن تاریخی مجسموں کو مسمار کیا تھا۔جن کی بعد میں مرمت کر دی گئی۔جب اس علاقہ میں اسلام داخل ہوا تو وہاں کے باشندے ان دونوں بتوں کو بعد میں ''سرخ بت اور خنگ بت'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔عنصری نے سلطان محمود غزنوی کے دور حکومت میں ان قصّوں کو اپنے شاعرانہ تخیل سے ایک مثنوی کی شکل میں نظم کا جامہ پہنایا۔چونکہ اس وقت عوامی داستانیں ''سرخ بت اور خنگ بت'' کے گرد گھومتی تھیں اور ان داستانوں کے خیالی کردار بھی یہی تھے۔اسطرح سے عنصری نے بھی اپنی مثنوی کا نام ''سرخ بت اور خنگ بت'' رکھا۔[۵]

'شاہنامہ فردوسی' بحر متقارب، 'ویس رامین' بحر ہزج مسدس مقصور از فخر الدین اسعدی گورگانی، 'پنج گنج نظامی'، عرفانی مثنوی 'حدیقہ الحقیت'[۶] سنائی بحر خفیف مخبون مقصور میں ہے۔یہ پہلی مثنوی ہے جہاں سے فارسی شاعری میں تصوف اور عرفان کے مضامین مثنوی میں سمودئے گئے ہیں۔اس کے علاوہ مئولفِ کتاب نے 'تحفتہ العراقین' خاقانی، 'روشنائی نامہ'، 'سعادت نامہ' از ناصر خسرو اور شیخ فریدالدین عطار کی متعدد مثنویات جیسے 'اسرار نامہ، الٰہی نامہ، مصیبت نامہ، جواہر نامہ، وصیت نامہ، منطق الطیر، بلبل نامہ، حیدر نامہ، شتر نامہ، مختار نامہ اور شاہنامہ۔نیز مثنوی مولانا روم، 'بوستان' سعدی اور ایران کے کلاسکی شاعری کے آخری بڑا شاعر جامی کی مثنویوں کا مجموعہ 'ہفت اورنگ' پر پہلے باب کا بحث اختتام کو پہنچایا ہے۔[۷]

متذکرہ بالا مثنویات کی وضاحت کے ساتھ ساتھ کتاب مذکورہ میں ان مثنویات کے کہنے والے شعرا کی ادبی زندگی اور کارناموں سے بھی واقفیت ملتی ہے جو الفاظ کے لحاظ سے مختصر لیکن معنی کے لحاظ سے نہایت ہی جامع معلومات ہے۔یہ اطلاعات فارسی کی کلاسکی شاعری سے وابستگی رکھنے والے دانشوروں، محققوں اور اسکالروں کے لئے دلچسپی اور رہنمائی کا باعث ہے۔

قبلؑ اشارہ دیا جا چکا ہے کہ 'فارسی مثنوی کا ارتقاء' میں مصنف نے دوسرے باب می ہندوستان میں فارسی مثنوی کا تفصیلی بیان پیش کیا ہے۔اور یہ بحث امیر خسرو کی مثنویات سے شروع ہو کر اور علامہ اقبال کی مثنویات پر اختتام پزیر ہے۔اس باب دوم میں جن مثنویات کا تذکرہ ملتا ہے ان میں سے چند اہم مثنویات ومثنوی نگاروں کے نام حسب ذیل ہیں:

خمسہ مثنوی امیر خسرو 'مطلع الانوار'، 'شیرین خسرو'، 'لیلیٰ مجنون'، 'آئینہ سکندری' 'ہفت بہشت' اور انکی تاریخی مثنویوں میں 'قرآن السعدین'، 'مفتاح الفتوح'، 'خزائن الفتوح'، 'دول رانی خضر خان'، 'مثنوی نہ سپہر'، 'تغلق نامہ' شامل ہیں۔اس طرح سے مئولف نے ہندوستان میں مثنوی کے موجد امیر خسرو کے حوالے سے اپنی بحث آگے بڑھائی ہے۔خسرو کی مثنویات کے بعد عصامی کی 'فتوح السلاطین'، شاہنامہ کی بحر متقارب میں، 'مجمع الافکار' 'فرہاد وشیرین' از عرفی شیرازی، 'مرکز ادوار' نل ودمن' سلیمان و بلقیس 'ہفت کشور' اور اکبر نامہ' ابوالفضل فیضی، 'ساقی نامہ' سوز وگداز' ملانوعی خبوشانی، 'ساقی نامہ' ظہوری، 'میخانہ' عبدالغنی فخر زمانی جو شاعر

کے معاصر مثنوی نگاروں کا تذکرہ ہے۔'جہانگیر نامہ' طالب آملی، 'رام سیتا' مسیحا پانی پتی، 'پیغمبر نامہ' قدسی مشہدی، 'شاہجہان نامہ' کلیم کاشانی، 'بادشاہ نامہ' قدسی مشہدی، 'شاہجہان نامہ' منیر لاہوری اور انکی دیگر مثنویات 'آب ورنگ' نور وصفا' ساز وبرگ' درد وعالم' یہ چاروں مثنویات ''چار گوہر منیر'' کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ ملا محسن فانی کشمیری کا خمسہ جس میں صرف چار مثنویوں کے نام لئے ہیں جیسے 'مصدر الاسرار' ناز ونیاز' ماہ ومہر' اور 'ہفت اختر' شامل ہے۔ ساغر کا 'ساقی نامہ' غم ودل' پری پیکر' سلیم تہرانی کا 'جنگ نامہ اسلام خان'، نعمت خان عالی 'سخن عالی' شاہنامہ گورگان' عاقل خان رازی 'شمع پروانہ' منظوم ترجمہ 'پدماوت' ہندی نظم ملک محمد جائسی ' سرخوش کی 'سسی پنوں' پنجاب کی مشہور داستان، 'محیط اعظم' طلسم حیرت' طور معرفت' عرفان' از میر زا عبدالقادر بیدل، 'ابجدِ فکر' انبانِ معرفت' ہیر رانجھا' از آفرین، 'تصویر محبت' سانحہ کربلا' شمس الضحیٰ' از میر شمس الدین فقیر، میرزا اسداللہ خان غالب جو مغل دور کے آخری بڑا شاعر ہے نے گیارہ مثنویاں لکھی ہیں۔ پہلی مثنوی 'سرمۂ بینش' ۲۔ درد داغ' ۳۔ 'چراغ دیر' ۴۔ 'رنگ و بو' ۵۔ 'باد مخالف' ۶۔ بیان نمودار ی نبوت وولایت' ۷۔ 'تہنیت عید شوال' ۸۔ 'در تہنیت عید بہ ولی عہد' ۹۔ 'دیباچہ نثر' جو اصل میں منظوم تقریظ ہے ،۱۰۔ 'تقریظ آئینہ اکبری' ۱۱۔ 'ابر گوہر بار' ۸۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی 'اسرارِ خودی' رموز بیخودی' زبور عجم' پس چہ باید کرد ای اقوام مشرق' اور ارمغان حجاز'۔ اس طرح سے اس کتاب کا دوسرا باب علامہ اقبال کی مثنویات پر اختتام پزیر ہوتا ہے۔۹

باب سوم میں 'پنجاب اور سندھ میں مثنوی' کے حوالے سے اس کتاب میں تذکرہ آیا ہے۔ مذکورہ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے مصنف نے اس بات کی طرف اشارہ دیا ہے کہ پنجاب میں قصّہ گوئی کو ہی مثنوی کہتے ہیں۔ پنجاب کے چار قصّے خاص طور سے مشہور زمانہ رہے ہیں جیسے ۱۔ ہیر رانجھا ۲۔ سسی پنوں ۳۔ مرزا صاحبہ اور ۴۔ سوہنی مہیوال یہ چاروں خالص پنجاب کی داستانیں ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پنجابی ادب میں مثنوی کو قصّہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ لفظ پنجابی میں فارسی زبان سے آیا جو عربی زبان سے مستعار ہے۔ جس کے معنی کہانی، افسانہ، داستان یا واقعہ ہیں۔ انھیں معنیٰ کے پس منظر میں پنجابی ادیبوں نے مثنوی کے لئے لفظ قصّہ استعمال کیا۔ اور پھر دھیرے دھیرے لفظ قصّہ ہی 'کتھا' بھی استعمال ہونے لگا۔ نتیجۃً پنجابی ادب میں یہ دونوں لفظ بیانیہ داستانوں میں ملتے ہیں۔ فارسی مثنوی اور پنجابی قصّوں میں جو بنیادی ادبی فرق ہے وہ صاحب کتاب نے اپنے الفاظ میں یوں رشتۂ تحریر میں پرویا ہے:

''پنجابی قصّوں کا موضوع اکثر عورت ہوتا ہے۔ عورت سے عشق، اسے حاصل کرنے کی کوشش اور نہ ملنے پر جنگ اور بعد میں ہیرو ہیروئن کی شادی ہوتی ہے۔ وہ دونوں ہی پُر سکون زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح داستان المیہ نہیں بن پاتی۔ بسا اوقات محبت دوطرفہ ہوتی ہے لیکن عشق وجنون ایک طرفہ ہوتا ہے۔ جبکہ فارسی مثنوی میں اس کے برخلاف عشق کسی سے ہوتا ہے اور شادی کہیں اور ہو جاتی ہے جس سے عشق کی آگ اور بھڑک اٹھتی ہے اس طرح مثنوی المیہ بن جاتی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ پنجابی قصّوں میں کنوارہ عشق کو کوئی جگہ نہیں ہے۔

تیسرا فرق کرداروں کا ہے۔ پنجابی قصّوں میں ہیرو متمول طبقہ سے تعلق رکھتا ہے وہ زمیندار شاہزادہ یا کوئی صاحب عزت شخص ہوتا ہے۔

جبکہ فارسی میں ہیرو عام اور پسماندہ طبقے سے ہوتا ہے مثنوی اور قصّوں میں بحروں کا بھی فرق ہے۔ قصّہ میں 'رباعی، 'دوہا'، 'کوِت'، 'یا کوڑا' کا استعمال کیا جاتا ہے اور مثنوی میں بیت کا سہارا لیا جاتا ہے''۔۱۰

مختصراً اس باب میں مندرجہ ذیل مثنویوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ جو اکثر پنجاب اور سندھ کی مشہور داستانیں مثلاً 'سسی پنون، خالص سندھی داستان، 'ہیر رانجھا' سوہنی مہیوال' اور 'میرزا صاحبہ'، پنجابی داستان سے ہے۔

''زیبا ونگار'' از حاجی محمد رضا غوری متخلص بہ رضائیؔ، مثنوی ''دستور عشق'' از منشی جوت پرکاش، ''نامہ عشق'' از اندر جیت منشی، ''وقائع پنوں'' از محمد حسین وشہباز خان، ''سسی پنوں'' از فرح بخش فرحتؔ، مولوی محمد سلامت علی خان متخلص بہ سلامیؔ کی ''طور عشق''، جو 'نل ودمن' کی بحر پر ہے۔

اسی طرح مصنف نے اس کتاب میں ایک دلچسپ بات تسکینؔ کے بارے میں کہی ہے کہ سسی پنوں کے بعد پنجاب کی دوسری مشہور داستان ''مرزا صاحبہ'' ہے۔ مرزا صاحبہ سے متعلق پہلی منظوم داستان تسکینؔ نے ہی نظم کی ہے اور اس داستان کا نام ''شمع محافل'' رکھا۔ اس کے بعد خیر اللہ فداؔ نے ''قندلذت'' نظم کی۔ پنجاب کی تیسری مشہور داستان ''سوہنی مہیوال'' ہے۔ اس داستان کو منظوم کرنے میں بہت سے شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اس کے اولین قلم بردار صالحؔ بنے۔ صالح کے بعد صاحب کتاب میں شیخ عطا محمد زیرکؔ کی مثنویوں کا تذکرہ کیا ہے جس نے داستان 'سوہنی مہیوال' کو ''ارژنگِ عشق'' کے عنوان سے نظم کیا ہے۔ آخر پر شیخ نجم الدین متخلص بہ مسکینؔ کی منظوم داستان ''قندلذت'' جو 'سوہنی مہیوال' داستان سے ماخوذ ہے، پر باب سوم اور کتاب مزکور اختتام کو پہنچتی ہے۔

نتیجہ: میرے مطالع کا محاصل یہ ہے کہ پروفیسر عزیز عباس نے اپنی اس کتاب ''فارسی مثنوی کا ارتقاء'' میں تقریباً ایک ہزار سال پر محیط ایک تاریخی، ادبی اور اجتماعی تحقیق فارسی شاعری کی قدیم صنف 'مثنوی' پر پیش کی ہے۔ جو کئی وجوہات کی بنا پر اہم ہے۔ مثلاً صنف مثنوی ہماری صدیوں کی اساس ہے۔ دوسری بڑی اہمیت اس لئے ہے کہ موصوف نے اس کتاب میں نہ صرف ایرانی شعرا کی مثنوی گوئی پر قلم اٹھایا ہے بلکہ انہوں نے ہندوستان اور پنجاب وسندھ میں بھی اس کے ارتقائی مراحل سے لیکر تقریباً مغل عہد تک کے اہم مثنوی گو شعرا اور ان کے کلام پر دقیق بحث پیش کی ہے۔

یہ کتاب ایک طرف مسلسل فارسی زبان وادبیات کی ترویج وتحقیق کے ساتھ ساتھ تاریخی اعتبار سے عہد بہ عہد مثنوی گو شعرا کی زندگی کی غمازی کرتی ہے، تو دوسری طرف بہت سے ایسے گم نام شعرا کے آثار پر بھی پُر مغز معلومات فراہم کرتی ہے جن کا تذکرہ عام تواریخ میں نہیں ملتا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کتاب کی وساطت سے مختلف ادوار میں فارسی شاعری کی قدیم صنف مثنوی کے جو کارنامے روبہ عمل آئے دراصل وہی ہمارے اسلاف کا قیمتی ادبی سرمایہ اور ہمارے لئے امتیاز بھی ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ چنانچہ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم اقوام کے بقا کا راز بھی بیشتر انہی مثنویات میں موجود ہیں، خواہ وہ شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولوی اور پنج گنج نظامی ہوں یا پھر امیر خسرو کی شاہکار مثنویات، فیضی کا نل ودمن، غالب کی گیارہ مثنویات اور علامہ اقبال کی بے بہا مثنویات ہوں یا پھر پنجاب کی مشہور داستانیں جیسے ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال اور سسی پنوں ہوں۔

مختصراً یہ کتاب اس لحاظ سے بھی قابل ستائش ہے کہ آج کے اس زوال پزیر دور میں جہاں دانشوروں، محققوں اور قلم کاروں کا رجحان انگریزی اور اردو ادبیات کی طرف گامزن ہے۔ اس کے باوجود جو اطلاعات اس کتاب میں تفصیل سے آئی ہے ہندوستان میں عصر حاضر میں یہ پہلی بار اس طرح کی باضابطہ کتاب صنف مثنوی پر تالیف ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں مصنف نے اس کتاب میں مثنویات کے بحروں پر بھی روشنی ڈالی ہے جو فارسی شاعری کے دلدادہ اور محققین کے لئے خاصی ہیں۔

موصوف نے اس کتاب میں عام فہم اور سہل زبان اختیار کی ہے جسے پڑھنے والے قارئین بوجھل نہیں ہو سکتے۔ تاریخی واقعات میں مختصر ہی سہی لیکن جامع جملوں سے کام لیا ہے۔ جس سے موصوف کی روایتی شاعری کے ساتھ گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن صاحب کتاب نے کشمیر کے فارسی مثنوی گو شعرا کے کلام کا فانی کشمیری کے علاوہ تذکرہ نہیں کیا ہے جبکہ کشمیر کے فارسی شعرا تقریباً کشمیر میں ورود اسلام سے لیکر ہر دور میں ایرانی وہندوستان کے دیگر ریاست کے شعرا کے شایان شان ایک کامیاب طبع آزمائی

کرتے آئیں ہیں۔اور وافر تعداد میں فارسی مثنوی کے نمونے چھوڑے ہیں مثلاً خمسہ مثنوی شیخ یعقوب صرفی جو انکی پانچ مثنویوں ''مسلک الاخیار''، ''وامق وعذرا''، ''مغازی النبی''، ''لیلیٰ مجنون'' اور ''مقامات مرشد'' پر مشتمل ہے۔اسی خمسہ کی تصنیف پر آپ ''جامی ثانی'' کے لقب سے بھی مشہور ہے، ۱۱میرزا اکمل بدخشی کی مثنوی ''بحرالعرفان'' اس مثنوی کے چار جلد ہیں اور تقریباً اسی (۸۰) ہزار اشعار پر مشتمل ہیں،۱۲شیخ عبدالوہاب نوری کی مثنوی ''عین العرفان'' وغیرہ۔اس کے باوجود جو اطلاعات اس کتاب میں مثنوی کے بارے میں آئی ہے وہ قابل ستائش ہیں۔دوران بحث جو شعرا کے کارناموں کے ساتھ ساتھ اشعار کی پیوندکاری ملتی ہے اُس سے اس کتاب کا حُسن تحریر اور دوبالا ہوجاتا ہے۔ساتھ ہی سادہ زبان اور عام فہم الفاظ کے استعمال جو ہر پڑھنے والے کے فہم وادراک کیلئے مفید ہیں سے کتاب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

اُمید ہے کہ ادبی حلقہ میرے اس مقالہ کی حقیر کوشش کی پزیرائی فرمائیں گے۔اور تفصیلی جانکاری کے لئے کتاب ھٰذا کی طرف رجوع فرمائیں گے۔

حواشی وکتابیات:

۱۔قلمی نسخہ، پیرغلام الدین سائف، نسخہ انکے بیٹے پیر محمد یوسف ساکنہ کھورپٹن، بارہمولہ، کے پاس موجود ہے۔

۲۔قلمی نسخہ از پروفیسر عزیز عباس، جملہ حقوق بحق موئف محفوظ ہے۔

۳۔اسلام وایران کے تقابلی خدمات جلد اوّل، تالیف آیت اللہ شہید مرتضٰی مطہری، مترجم مولانا شیخ ممتاز علی، سن اشاعت ۲۰۱۱ء، ناشر رایزنی فرہنگی سفارت جمہوریہ اسلامی ایران، نئی دہلی، ص۱۰

۴۔''فارسی مثنوی کا ارتقاء'' ڈاکٹر عزیز عباس اشاعت ۲۰۰۷ء، ناشر شہید پبلیکیشنز، آزاد مارکٹ دہلی۔۶ص۹۔۱۰

۵۔قلمی نسخہ، پروفیسر عزیز عباس، جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ ہے۔

۶۔حاشیہ: بقول پروفیسر عزیز عباس حکیم سنائی نے اس کتاب کا نام ''الٰہی نامہ'' بھی تجویز کیا تھا۔مگر تاریخ کے اوراق میں 'حدیقہ سنائی' کے نام سے مشہور ہوئی۔''فارسی مثنوی کا ارتقاء، ص ۲۵

۷۔ایضاً۔ص۱۹تا۲۵

۸۔حاشیہ: اس مثنوی کے آغاز میں اگرچہ غالبؔ نے حسب معمول قدیم مثنوی گوشعرا کی طرح 'سپاس نامہ' سے آغاز کیا ہے۔اور اس کے بعد مناجات ونعت رسولؐ، منقبت حضرت علیؑ، لیکن منقبت کے بعد جو مغنی نامہ کے تحت نظم پیش کی ہے وہ بقول پروفیسر عزیز عباس ''مغنی نامہ' غالب کی ایجاد ہے۔اس سے قبل کسی نے 'مغنی نامہ' نہیں لکھا۔،،،اس میں عقل کی تعریف کی گئی ہے'' فارسی مثنوی کا ارتقاء ص ۸۸

۹۔ایضاً۔ص۴۶تا۹۲

۱۰۔ایضاً۔ص۹۵

۱۱۔کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، از پروفیسر عبدالقادر سروری، ناشر مجلسِ تحقیقات اُردو کشمیر، سرینگر سال ۱۹۶۸عیسوی، ص۸۴

۱۲۔ایضاً۔ص۱۷۵

نوٹ۔راقم نے اس کتاب کے مطالع میں میں پروفیسر موصوف کے اصلی قلمی نسخہ سے ہی بیشتر استفادہ کیا ہے۔اور مکمل نسخہ جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر لیلیٰ عبدی خجستہ
ایران

ارمغانِ ایران (۲)
ایران میں مختلف موضوعات میں شائع شدہ کتب کا تعارف

ڈاکٹر لیلیٰ عبدی خجستہ، شعبہ اردو، تہران یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر چکی ہیں۔ فارسی ادبیات پر شائع ہونے والی تحقیقی و تنقیدی کتب سے خاص الفت رکھتی ہیں اور ایسے شاہکاروں کے اشتہار کے لئے کوشاں رہتی ہیں جن کا کم از کم علم فارسی زبان و ادب کے اساتید و طلباء کو ہونا چاہئے دبیر (شمارہ ۱۱) کے لئے انہوں ارمغان ایران کے نام سے ان کتب کی فہرست ارسال کی تھی جو عہد حاضر میں شائع ہوئیں، اب اس شمارہ میں ارمغان ایران کا دوسرا حصہ شائع کیا جارہا ہے۔ امید کرتا ہوں قارئین کے علم میں اضافہ ہوگا۔

۱۔ کتاب شناسی نقد و بَررسی ادبیات داستانی مُعاصر

مرتب: فاطمہ فَر ہودی۔ ناظر: حسن میر عابدینی

پبلشر: فرہنگستان زبان و ادب فارسی، تہران

پہلا شمارہ: سنِ اشاعت: ۲۰۱۴ء۔ ان داستان نویسوں کے سوانحی حالات اور تالیفات شامل ہیں: سیّد محمّد علی جمال زادہ؛ صادق ہدایت؛ بُزرگ علَوی

دوسرا شمارہ: سنِ اشاعت: ۲۰۱۷ء۔ ان داستان نویسوں کے سوانحی حالات اور تالیفات شامل ہیں: جلال آل احمد؛ صادق چوبک؛ سیمین دانش ور؛ ابراہیم گُلستان

۲۔ مشاہیرِ کتاب شناسیِ مُعاصر

پبلشر: خانہ کتاب، تہران

یہ سلسلہ وار کتابیں ہر ایک ایرانی بلند پایہ شخصیّت پر شامل ہے جنھوں نے فہرست نویسی، تالیف اور ترجمہ کے حوالے نمایاں کام سرانجام دیا ہے۔ ہر کتاب میں مشہور شخصیّت کے سوانحی حالات، خدمات، آثار اور تالیفات شامل ہیں۔ ۲۰۱۵ء سے لے کر اب تک اس سلسلہ کے ۲۸ رشمارے شائع ہوئے ہیں اور اس کی اشاعت جاری ہے۔

(۱) یوسف اِعتصامی۔ مرتب: سیّد فرید قاسمی
(۲) محمّد علی تَربیت۔ مرتب: مجید غلامی جَلیسہ
(۳) آقا بزرگ تہرانی۔ مرتب: احمد رضا رحیمی
(۴) محمّد نخجوانی۔ مرتب: ہادی ہاشمیان

(۵) سعید نفیسی۔مرتب: محمّد جواد احمدی نیا
(۶) خان بابامَشار۔مرتب: علی صادق زادہ وایقان
(۷) ابن یوسف شیرازی۔مرتب: محمّد برکت
(۸) سیّد جلال الدّین محدّث اُرموی۔مرتب: عبدالحسین طالعی
(۹) محمّد رمضانی۔مرتب: سیّد فرید قاسمی
(۱۰) محسن صبا۔مرتب: محمّد حسین مَرعَشی
(۱۱) محمّد تقی دانش پژوہ۔مرتب: سیّد محمّد حسین حکیم
(۱۲) یحییٰ ماہیار نوّابی۔مرتب: احمد شعبانی
(۱۳) کیکاوس جہان داری۔مرتب: ہما اُفراسیابی
(۱۴) احمد گلچین مَعانی۔مرتب: محمّد فرح زاد
(۱۵) محمّد آذریزدی۔مرتب: حسین مسرّت
(۱۶) علی نقی مُنزوی۔مرتب: حبیب بابائی
(۱۷) ایرج افشار۔مرتب: سیّد فرید قاسمی
(۱۸) کاظم مدیرشانہ چی۔مرتب: سیّد محسن ناجی نصرآبادی
(۱۹) عبدالعزیز طباطبائی۔سیّد محمّد طباطبائی
(۲۰) سیّد محمّد علی روضاتی۔مرتب: محمّد رضا زادہوش
(۲۱) کرامت رعنا حسینی۔مرتب: احمد شعبانی
(۲۲) عبدالحسین حائری۔مرتب: احسان اللہ شکر اللّٰہی طالقانی
(۲۳) اسماعیل شیخ المشائخ امیر مُعزّی۔مرتب: سیّد علی آل داوود
(۲۴) مُظفّر بختیاری۔مرتب: مسعود راستی پور
(۲۵) عبدالحمید ابوالحمد۔مرتب: احمد شعبانی
(۲۶) عبداللہ نورانی۔مرتب: علی صادق زادہ وایقان
(۲۷) سیّد شہاب الدّین مَرعَشی نجفی۔مرتب: ع. رجائیان
(۲۸) عبّاس زریاب خوئی۔مرتب: مرتضی ہاشمی پور

۳۔ نُزهَة القُلوب (از: حَمداللّٰه مُستوفی)

تصحیح ومقدمّہ: میر ہاشم محدّث

پبلشر: سفیر اُردہال، تہران

سنِ اشاعت: ۲۰۱۷ء

حمداللہ مُستوفی نے (۶۸۰۔۷۵۰ہجری) یہ کتاب ۷۴۰ ہجری میں تالیف کی تھی۔ کتاب تین حصے پر مشتمل ہیں: (۱) معدنیات، نباتیات، حیوانیات (۲) انسانی جسم اور روح (۳) جغرافی۔ میر ہاشم محدّث نے پانچ نسخوں کے مقابلے کے بعد مذکورہ کتاب کی تصحیح کی ہے۔

۴۔ پنج رساله حُروفیّه (از: سیّده شریف۔ نوین صدی ہجری)

تصحیح ومقدمّہ: ولی قیطرانی

پبلشر: میراثِ مکتوب، تہران

سنِ اشاعت: ۲۰۱۷ء

فضل اللہ اَستَر آبادی (وفات: ۷۹۶ہجری) فرقہ حروفیّہ کے موسس تھے۔ سیّد شریف ان کے خلفا میں سے تھے جنھوں نے کئی رسائل تالیف کی تھی۔ مذکورہ کتاب میں ان کی یہ رسائل شامل ہیں: (۱) فلسفہ نماز ۲۸/اور ۳۲/ہندسے کی بناپر (۲) وجہ تسمیہ سبع المَثانی (۳) حروفِ مقطّعہ اور عبادت کا رابطہ (۴) شرح پنجاہ بیتِ اوّل عرش نامہ (۵) تحقیق نامہ

۵۔ تاریخِ شَفاہیِ کتاب؛ گفتگو با ناشران و کتاب فروشان (ایران میں کتاب کا اورل ہسٹری؛ ایران میں ناشروں اور کتاب فروشوں سے گفتگو)

مرتّب: نصراللہ حدّادی

پبلشر: خانہ کتاب، تہران

سنِ اشاعت: ۲۰۱۷ء

مذکورہ کتاب میں ایران کے بیس پبلشرز اور بُک سیلرز سے گفتگو کرتے ہوئے ان کے قیمتی تجربوں کا Oral History ترتیب دی گئی ہے: سیّد احمد رضا طَہوری (طَہوری پبلی کیشن کا مدیر)؛ محمّد قاسم لیما صالح رامسری (معین پبلی کیشن کا مدیر)؛ ابوالقاسم علمی ـ محمود علمی (جاویدان پبلی کیشن کے مدیر)؛ داوود رمضان شیرازی۔ مہدی رمضان شیرازی (سنائی پبلی کیشن کے مدیر)؛ حسین مُفید (مولیٰ پبلی کیشن کا مدیر)؛ سیّد ناصر میر باقری خوانساری (خانہ فرہنگ و ہنر گویا پبلی کیشن کا مدیر)؛ امیر حسین زادگان (قُقنوس پبلی کیشن کا مدیر)؛ شاہرُخ ترقّی (خیّام پبلی کیشن کا مدیر)؛ محمد علی جعفریہ (ثالث پبلی کیشن کا مدیر)؛ حسن محجوب (شرکتِ سہامی انتشار پبلی کیشن کا مدیر)؛ محسن بخشی (آگاہ پبلی کیشن کا مدیر)؛ نادر قدیانی (قدیانی پبلی کیشن کا مدیر)؛ علی رضا رئیس دانائی (نگاہ پبلی کیشن کا مدیر)؛ پرویز علی بیگ (مُروارید پبلی کیشن کا مدیر)؛ علی محمدی اَردہالی (کانون محمدی پبلی کیشن کا مدیر)؛ سیّد مجید طالقانی (نقشِ جہان پبلی کیشن کا مدیر)؛ شمس ہوشی دری فَراہانی (فَراہانی پبلی کیشن کا مدیر)؛ مہدی نودہی راد (تہران کا فردوسی بک سیلر)؛ کاظم علی (موسسہ گُسترش فرہنگ و مطالعات کے ادارہ کا مدیر)

۶۔ ادبیات عامیانه ایران؛ مجموعه مقالات درباره افسانه ها و آداب و رُسومِ مَردمِ ایران

مرتّب: محمّد جعفر محجوب۔ بہ اہتمام: حسن ذوالفقاری

پبلشر: چشمہ، تہران

سنِ اشاعت: ۲۰۱۴ء (پانچویں اشاعت)

مرحوم محمّد جعفر محجوب نے (۱۹۲۵۔۱۹۹۶ء) مختلف اخبارات اور رسائل میں ایرانی فولکور کے حوالے سے مضامین لکھتے رہتے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں یہ مجموعہ مقالات دو جلدوں میں ''ادبیاتِ عامیانہ ایران'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر حسن ذوالفقاری نے (پیدائش: ۱۹۶۷ء) اس کتاب پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے ایک ہی جلد میں شائع کروائی ہے۔ مذکورہ کتاب میں یہ مباحث شامل ہیں: عوام کی تہذیب اور زبان؛ عوامی کہاوتیں، پہیلیاں، رسمیں، داستانیں، ڈرامہ وغیرہ۔

۷۔ نفائس المآثر (فارسی تذکرہ)

مولف: علاءالدّولہ کامی قزوینی۔ مصحح: سعید شفیعیون

پبلشرز: مجلسِ شورای اسلامی۔ دانشگاہِ آزاد اسلامی، تہران

سنِ اشاعت: ۲۰۱۶ء

علاء الدّولہ بن یحییٰ السّیفی الحسینی متخلّص کامؔی نے یہ تذکرہ دسویں صدی ہجری میں تالیف کی ہے جس میں ایران کے صفوی دور اور ہند کے تیموری دور کے نادر معلومات شامل ہیں۔تذکرہ میں ۴۹۴؍فارسی شعرا کے سوانحی حالات شامل ہیں۔ڈاکٹر شفیعیون نے چار نسخوں کا مقابلہ کیا ہے۔

۷۔ تَداوُم و تحوّل در تاریخ نگاریِ ایران: بَررسی و تحلیلِ آثارِ شهاب الدّین عبداللّه خوافی (حافظ اَبرو)

مولف: غلام رضا امیر خانی

پبلشر: طرحِ نقد، تہران

سنِ اشاعت: ۲۰۱۷ء

حافظ اَبرو (وفات: ۸۳۳ ہجری) خُراسان کے بلند پایہ تاریخ نگار تھے۔کتاب کے ابواب: پہلا باب: حافظ اَبرو کے دور اور ان کی زندگی۔دوسرا باب: تیموری حکومت کے پہلے پچاس سال کی تاریخ نگاری۔تیسرا باب: حافظ اَبرو کی تالیفات۔چوتھا باب: بینش؛ سیاسی اور ثقافتی تفکّرات پانچواں باب: تاریخ نگاری کا اسلوب؛ تحوّل اور طریقہ

۸۔ کتاب شناسی موسیقی در ایران

مرتّب: سیمین جلالی

پبلشر: موسّسہ فرہنگی۔ہُنری ماہور، تہران

سنِ اشاعت: ۲۰۱۷ء

ویدا مشایخی نے ۱۳۵۳ شمسی میں کتاب شناسی موسیقی تدوین کیا تھا۔کتاب کے سولہ ابواب: (۱) کُلّیات (۲) فلسفہ اور جمال شناسی (۳) تاریخ اور نقد (۴) سرگذشت نامے (۵) موسیقی کے فن کے اصول اور مسائل (۶) آلات (۷) وہ موسیقی جو متن کے ساتھ بجائی جاتی ہے (۸) موسیقی رقص (ڈانس) (۹) موسیقی اطفال (۱۰) عوامی موسیقی (۱۱) اتنوموزیک لوجی (۱۲) فیزیک اور اکوستیک (۱۳) موسیقی کی تعلیم (۱۴) موسیقی سے متعلّق انجمنیں اور ادارات (۱۵) پروگرامز (۱۶) موسیقی سے متعلّق میوزیم اور نمائش

۹۔ نوادر ترجمه کتابِ: مُحاضَرات الأدَباء ومُحاوَرات الشّعراء و البُلَغاء

مولف: حسین بن محمّد راغب اصفہانی۔مترجم: محمّد صالح بن محمّد باقر قزوینی۔مرتّب: احمد مجاہد

پبلشر: سُروش، تہران

سنِ اشاعت: ۱۹۹۳ء

راغب اصفہانی نے (وفات: تقریباً ۳۹۶ ہجری) یہ کشکول ترتیب دی تھی جو نظم اور نثر پر مشتمل ہے۔اس میں: امثال، تاریخی، ادبی، معاشرتی، معاشی، تعلیمی وغیرہ کے نکات، اقوال اور حکایتیں شامل ہیں۔داستانیں اور حکایات حقیقی واقعات پر مبنی ہے۔اس کتاب میں ۳۰ ہزار مضامین اور ۹۰۰۰؍ابیات (فارسی اور عربی) شامل ہیں۔باقر قزوینی نے (وفات: ۱۱۱۷ ہجری) اس کتاب کا فارسی ترجمہ

کیا تھا۔احمد مجاہد نے (پیدائش:۱۹۶۳ء)اس کتاب کے مقدّمہ میں راغب کے جامع سوانحی حالات تحریر کی ہے۔

۱۰۔دانش نامه معاصرِ قرآنِ کریم(قرآن کریم کامُعاصر دائرۃ المعارف)

چیف ایڈیٹر:ڈاکٹر سیّد سلمان صفوی

پبلشرز:ایران اسٹڈیز اکیڈمی(لندن)،لندن۔قُم

سنِ اشاعت:۲۰۱۷ء

اس دائرۃ المعارف میں ۱۷۷۱ اندراجات شامل ہیں

۱۱۔رَه آوردِ ہند (بَرگردانِ ہفت متنِ پَہلوی به فارسی)

مولف:صادق ہدایت۔بہ اہتمام:خُسرو کیان راد

پبلشر:کولہ پُشتی،تہران

سنِ اشاعت:۲۰۱۷ء

صادق ہدایت نے(۱۹۰۳ء۔۱۹۵۱ء)ہند کا سفر کیا تھا اور ایک سال(۱۹۳۶ء۔۱۹۳۷ء)بمبئی میں قیام کیا تھا۔ہندوستان میں رہ کر انھوں نے پہلوی کی زبان اور رسم الخط سیکھا اور کچھ پہلوی متون کا فارسی ترجمہ کیا تھا اور ایران کی واپسی کے بعد ان کے کچھ حصے چھپوائے۔اب مذکورہ کتاب میں تمام تراجم مکمّل طور پر شامل ہیں:''گجستہ ابالیش''؛''زندوِہومن یسن''؛''شہرستان ہائے ایران''؛''کارنامہ اردشیر بابکان''؛''گزارش گمان شکن''؛''یادگارِ جاماسپ''؛''آمدنِ شاہ بہرام ورجاوند''

☆☆☆

ISSN: 2394-5567 UGC No. 47011 S. No. 14

بخواندم یکی مرد هندی دبیر سخن گوی و گوینده و یادگیر

(فردوسی)

DABEER

(An International Peer Reviewed Refereed Quarterly Literary Research Journal for Persian Literature)

VOLUME: V ISSUE: II

April-June 2018

Editor

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Address:

Dabeer Hasan Memorial Library

12, Choudhri Mohalla, Kakori,Lucknow,

U.P.-226101 (INDIA)

Review Committee

Prof. Azarmi Dukht Safavi, Aligarh

Prof. Shareef Hussain Qasmi, Delhi

Professor Abdul Qadir Jafery, Allahabad

Professor Umar Kamaluddin Kakorvi, Lucknow

Prof. Tahira Waheed Abbasi, Bhopal

Editorial Board

Prof. Syed Hasan Abbas, Director Rampur Reza Library, Rampur

Prof. S. M. Asad Ali Khurshid, Director IPR, AMU, Aligarh

Prof. Aleem Ashraf Khan, HOD Persian, DU, Delhi

Prof. S. M. Asghar, HOD Persian, AMU, Aligarh

Prof. Shahid Naukhez, HOD Persian, MANUU, Hyderabad

Dr. Mohammad Aquil, HOD Persian, BHU, Varanasi

Dr. Iftikhar Ahmad, HOD Dept. of Persian, Maulana Azad College, Calcutta

Dr. Anjuman Bano, Dept of Persian, Karamat Degree College, Lucknow

Co-Editor

Atifa Jamal

Research Scholar

Department of Persian

Luscknow Universitv, Lucknow

Abdulla Molla,
Guest Teacher,
Deptt. of Arabic, Persian, Urdu
and Islamic Studies, Visva-Bharati,
Santiniketan-731235, (WB).

Influence of Arabic on Persian Language and Literature

Abstract: ***Both of the languages i.e. Arabic and Persian are influenced in their depths and dimensions by the Islamic civilization and in any way we cannot cut the link amongst them because they both present the images of Islamic nation and civilization. The Persian language and literature is affected by Arabic language as there is countless Arabic words use in it. This is an evidence that they both branched out from one origin which is the religion of Islam. Therefore, the person who will study them they will certainly be enlightened of the civilization of Islam in all of its manifestations. The impact resulted from the mixing and contact between two nations is very necessary and a normal thing which is very important because it leads the national languages and literatures to alleviate the intolerance.***
Key words: ***Co-relations, Arabic, Persian, Arab-Islamic Culture, Islamic Nation and Civilization***

All of the languages in the world have a particular importance because language is the tool of expression and imaging of human feelings and emotions that are underlying inside the human soles as it is the human soles. The language is a mirror to the lives of peoples; we see the full pictures flipped to its culture, geographic region, civilization, its development, the customs and traditions: Its happiness and sorrow, society and its economy and its living and death. Arabic language is a result of mixing among the dialects of peoples inhabited the Arabian Peninsula. According to Theodor Noldeke said: There were few differences between the dialects in the core parts of the Arabian Peninsula, such as Hijaz, Najd and region of Euphrates, this dialect (the fluent standard Arabic) developed by all of these dialects.

The Semitic Arabic grew and passed through various stages of its development, then its characteristics completed and civilized in the synagogues and Arab markets, then Arabs practiced its arts that flourished and grew up in the field of poetry and prose wisdoms. We learn Arabic language and teach it because it is an immortal living language it will never die because it is the language of an immortal Book the Holy Qur'an, a language written for it to stay

and to be alive always as God the Almighty said: "It is We who have sent down the Reminder and We will, most surely, safeguard it".[1] It is the teachings of Mohammed (PBUH) the Prophet said: "The best of you is who learnt the Holy Qur'an and taught it".[2] It is known that the knowledge and teaching of the Holy Qur'an cannot be possible but only by the study of Arabic language. Since the Arab conquest of Iran in the 1st/7th century and the subsequent conversion of a majority of the population to Islam Arabic as the language of contact of the Muslim scripture and liturgy and of a large volume of wide-ranging scholarly literature for more than a thousand years thereafter has exercised a profound influence on the Persian language. Apart from the writing system this influence is evident chiefly in the large Arabic vocabulary that has been incorporated into the Persian lexicon.

Persian is the second languages of the Islamic world after Arabic and it has a great relation with Arabic. The relationship between them is a very old and long relationship as it is known that when Islam came the Persia people had their influence in the new Muslim community. The emerging Islamic state could not dispense with the experience of Persians who converted to Islam were performing their services for the new state were collecting the taxes and holding the registers related to the taxes and determining the tax on all of the people funded as they generally carry out all that is required to them and representing the state in the territories. Arabs remained dependent to a long period of time on what they put their own administrative systems and financial affairs. As a result of this situation a lot of Persian words and idioms for these affairs entered the Arabic language. On the whole Persian civilization had spread in the Muslim community in different social, political and cultural fields. Persian language had become a common language in the states of the Muslim world.[3]

It is clear and does not require a proof that the peoples related to the languages of their fathers and forefathers spending their childhood accustoming and raising in their surroundings are usually strong even they cannot be removed by the events of time especially when these languages are rooted from their cultural heritage dates back to the ancient times as the case of the Persian language which astonished Alexander the Great in his campaign on the land of Persia including the books found by him where he copied translated and carried a lot of them with him and burned and destroyed a lot of them too.[4] The transformation of Persian from the ancient Pahlavi language to the modern

[1]) Surah al-Hijr:09
[2]) Sahih al-Bukhari:5027
[3]) Ṭāhā Nadā (Dr.). (1980) Comparative Literature, Cairo: House of the Knowledge, p. 38
[4]) Ibn al-Nadim. 'Glossary'. Beirut: House of the Science, p.333

Persian is sufficient evidence in itself to show the depth of Arab influence in the Persian culture; so that most of the differences between the old Pahlavi and the modern Persian reflected in these things:

- The modern Persian adopted the Arab-Islamic culture.
- It contained many Arab words and influenced by Arabic vocabularies and phrases in the drafting of some of its vocabularies and phrases.
- It adopted the weights and assonance rhymes in Arabic and other benefactors.
- It used Arabic calligraphy instead of Pahlavi letters of writing.[5]

This adaptation indicates that this transformation was not just a natural growth can be subjected to any language of the people in their transition from one phase to another but it was an unusual shifting even it can be described as "the revolutionary movement." It is clear that such a transformation cannot happen in a short period it has to happen for a long time as the Old Pahlavi became to be known Persian Dari in two hundred years since the migration. It is well-known that Persian Dari became the official and literary language of Iran since the mid-third century,[6] including the second language of the Muslim world and the followers of this religion in the ancient world took writing down their religious evidences and documents in Persian after Arabic.[7] The truth is that the transition from ancient Persian (Pahlavi) to modern Persian or Persian Dari was not directly but it was through the mediation of Arabic language which had been able over the time to defeat the Pahlavi Persian. There was a combination of factors behind that fact including: The Pahlavi writing and language both were more difficult than the Arabic writing and language as the field of words and terms was narrower in Pahlavi letter and language.

Arabic language and the writing in Arabic both became strong after one hundred years of Arab conquest due to the translation of the scientific books from Syriac, Greek, Hindi and Persian language and also because of being the language of government and its official writing in Arabic both were the needed resource more than any other side.[8] Among these factors there is also another factor that the Islamic religion which embraced by the Persian encouraged them to learn Arabic language and the link of Pahlavi language to the religious life of the ancient Zoroastrian religion in Iranian minds took them away from the Pahlavi language. In addition to the Pahlavi language and writing was not

[5]) Aḥmad Amin Zaki Nagib Maḥmūd: The Story of literature in the world, part 1, p. 439
[6]) Ḏabiḥullah: The history of literature in Iran.
[7]) Muhammad Muhit Taba Tabayi. "Influence of Islam in Persian literature". Iran: Yagma, Sal-e-Bist, complements, Ninth Edition, p.477
[8]) Muhammad Taqi Bahar: Subuk Shanasi, Iran: Part.1, p.181

common among the Persians themselves as it was confined to a private layer which was the layer of writers: (Dabīrān) making it easier for the Persian to move to the new Arabic script and unfortunately the Pahlavi was the language of the adjacent areas to the Arab countries and these areas had been always on the way of various Arab invasions and attacks toward the east.[9] According to Ibn Khaldūn: "The weak person is always being in a need to emulate the stronger in his logo, uniform, living style and other conditions of the revenues".[10] Now it became clear to us that the conflict between Arabic and Pahlavi despite the second language was in its own backyard had been not equal it was not inevitable that Pahlavi take the process towards the vanishing and Arabic language become the most powerful language of Iran and this was what happened.

However, the things began to be changed in the third century after the establishment of independent Persian states from the Abbasid caliphate as these states had tried to cut the link Persian to the language of caliphate or weaken the very least. However, Persian poured their great attention to the tone of the people in the East which was known as "Farsi Dari", the dialect that was used in the court of the rulers in (Bukhara) and surrounding areas hence, this name: 'vestibule' was taken for the 'state' from there. So, this dialect began to grow and spread even had become the official and literary language of Iran but in its growth and spreading its saturation was increasing with the characteristics of Arabic language which did not leave the arena at all though the lack of luster from its previous status. Since Arabic lexical morphology is highly systematic, certain prefixed and suffixed formatives of Arabic are salient in the Persian dictionary as are certain assonant word patterns. Thus the letter *mım*, the initial of three highly productive Arabic prefixes, accounts for about 1,800 loanwords or almost a quarter of the Arabic vocabulary in modern Persian. With a few exceptions Arabic loanwords in Persian are written exactly as in Arabic. They were incorporated directly from Arabic by bilingual scholars who had no need to vernacularize them; doubtless the sanctity of Arabic script as the vehicle of the Holy Qur'an also militated against any alteration. A number of Arabic characters represent consonants alien to Persian which are therefore assimilated to the closest Persian phonemes. The three 'short' vowels of Persian were equated with those of Arabic and not represented in the orthography; the three 'long' vowels were equated with those of Arabic and represented by *alif, waw* and *yaa* as *matres lectionis*.

[9]) Ṭāhā Nadā (Dr.): Comparative Literature. Beirut: Arab Renaissance Publishing House1991, pp. 39-40

[10]) Ibn Khaldun. Introduction. Beirut: investigated by: Dervish Juwaydi, the modern library, p.137

The early development of Islamic Persian language and literature is faced with the same problem—the absence of contemporary material. We are not to suppose that Persian was not written down until the 3rd/9th century yet we do not even know when the Pahlavi alphabet was abandoned in favor of the Arabic. The earliest surviving Persian manuscript in Arabic script from the beginning of the 4th/10th century and from this we can see that the principles underlying the adaptation of the Arabic script to the writing of Persian were already established. Arabic loanwords appear in their Arabic form without change of spelling; Persian sounds not found in Arabic are represented by their nearest equivalent, thus *pāʾ* by *bāʾ*, *čīn* by *jīm*, *gāf* by *kāf*.

The most significant impact of Arabic on Persian has been in the expansion of vocabulary a process that seems scarcely to be complete even at the present day. Once again we are handicapped in examining the origins of this development by lack of contemporary material; the earliest samples of New Persian consist of a handful of verses dating from the end of the 3rd/9th century by which time the influx had been going on for two centuries. According to M. Bahār the process began with words mainly of an administrative or religious nature, for which no Persian equivalent existed; but it must very soon have passed this stage. The four verses by Ḥanẓala of Bādḡīs contain out of 54 words, three Arabic words (if we except the controversial *ǰāh*) '*ḵaṭar*', '*ʿezz*', and '*neʿmat*'; but doubts have been expressed as to the authenticity of these verses in their extant form, first cited in the 6th/12th century "*Čahār maqāla*." Other poets of the same period Moḥammad b. Waṣīf and Bassām-e Kord, first cited in the 7th/13th century "*Tārīḵ-e Sīstān*" have a remarkably high proportion of Arabic words amounting to about a quarter of their total word stock but it must be emphasized that available material is too small to be statistically significant. In general the percentage of Arabic words used by the early poets (as cited in *Lazard*, *Premiers poètes*) stands at about ten percent. Certain poets seem to have made an effort to avoid the use of Arabic. Rūdakī for example, in the hundred *bayt*s that survive of his "*Kalīla wa Demna*" uses only about twelve words from Arabic; on the other hand, the main body of his surviving verse contains eight to nine percent. The '*Šāh-nāma*' notoriously contains very few Arabic words though even here estimates differ widely—P. Horn offers 430, Humbert 984, Ḵānlarī 800 and these figures refer to lexical items not to total vocabulary. Humbert estimates that 22 words are used more than 100 times while 470 are used only once.[11] One might conclude from all this that the overall percentage is about two percent. In the case of prose works subject matter clearly has a greater influence than in poetry. Ḵānlarī has pointed out that the proportion of Arabic

[11]) Ḵānlarī, "Loḡathā-ye ʿarabī dar Šāh-nāma," pp. 405-6

words is significantly less in works like "*Samak-e ʿAyyār*" or the "*Eskandar-nāma*" than in religious and philosophical treatises such as the "*Kašf almaḥǰūb*."[12]

It was suggested above that the primary stimulus to the importation of Arabic into Persian was utilitarian but this clearly did not remain the case for very long. A knowledge of Arabic (which long remained the only language for religious, philosophical and scientific works) was regarded as essential equipment for an educated man and it was obviously tempting for him to introduce Arabic words into his Persian writing. Whatever the motive, the intermixture of Arabic with Persian continued apace until by the 6th/12th century some works contained as many as eighty percent of Arabic words. The influence was not confined to the incorporation of new words (though the point was reached where any Arabic word was considered eligible for use and dictionaries were scoured for fresh material to inflate the vocabulary of learned writers). Arabic grammatical usage also found its way into Persian though usually only with Arabic words. By the post-medieval period there seemed no longer to be any distinction in the mind of the writer between Arabic and Persian words which were used interchangeably. Modern times Arabic words had became such an accepted element in Persian vocabulary that they hardly seemed to be recognized as such. Arabic words had long been treated grammatically as though they were Persian but now Persian words began to acquire Arabic suffixes to an extent not seen before.

It is especially significant that when the need arose for new words to describe new political ideas particularly during the Constitutional period in the early years of the present century, politicians and journalists instinctively turned to Arabic rather than Persian. Nor did they by any means restrict themselves to the words that Arabs themselves chose. An obvious example is the word for 'Constitution,' Arabic '*dostūr*' (in origin a Persian word), Persian '*mašrūṭa*'; many others could be cited, e.g. 'Mandate'—Arabic '*entedāb*', Persian '*qaymūmīyat*'; "United Nations"—Arabic "*al-omam al-mottaḥeda*", Persian "*melal-e mottafeq*"; 'Charter'—Arabic '*mīṯāq*', Persian '*manšūr*'. Here a domesticated form of Arabic exerts its influence from within the host language. Many Arabic words used in Persian today would scarcely be recognized in the lands of their origin: '*mawqeʿīyat*', '*eʿzām*', '*ešḡāl*', "*monawwar al-fekr*." The tendency towards simplification of language still has some of its impetus.

[12]) *Tārīḵ-e zabān-e fārsī* II, p. 55

Novelists and fiction writers tend to restrict their use of Arabic, perhaps to as little as ten percent. Journalists accept a higher proportion of the order of twenty percent. The highest percentage of Arabic is still to be found in the writings of religious authorities, the language of the *mollās* that was satirized sixty years ago by Moḥammad ʿAlī Jamālzāda in his famous short story "*Fārsī šekar ast*."

In conclusion we can say that above mentioned the influence of Arabic on Persian language and literature just only for the example but the reality is that the most of the languages not only in the Arab-Islamic World but some languages in Asia, Africa and Europe also have been influenced by Arabic language and literature.

Bibliography:

1) ʿA. A. Ḥekmat, Pārsī-e nag̃z, Tehran, 1951.
2) Browne, Lit. Hist. Persia, esp. vol. I, chap. 1, vol. II, chap. 2.
3) C. E. Bosworth, "The Interaction of Arabic and Persian Literature and Culture in the 10th and Early 11th Centuries," al-Abhath 27, 1978-79.
4) Idem, Tārīk̲-e zabān-e fārsī, 4 vols. in 5, Tehran, 1969-78.
5) Idem, "The Persian Impact on Arabic Literature," The Cambridge History of Arabic Literature I, Cambridge, pp. 483-96.
6) M. Dj. Moinfar, Le vocabulaire arabe dans le Livre des rois, Wiesbaden, 1970.
7) P. Horn, "Neupersische Schriftsprache," in Geiger and Kuhn, Grundr. Ir. Phil.
8) R. Levy, The Persian Language, London, 1951.

Abid Ibrahim
Research Scholar, Department of Persian
Punjabi University Patiala, Punjab

The origin of modern Persian Poetry

Abstract: ***By the end of nineteenth century national movements had emerged in various Asian countries as a repercussion to western imperialism. One of these was the revolutionary movement of Persia. The object of which was to protect the country from the exploitation of western powers and to replace the age old despotic system by a representative form of government. In 1906, after a short struggle the nationalists were successful in having their demands accepted by the reigning monarch, Muzaffar-ud-din Shah and the constitutional regime was inaugurated in Persia. The history of modern Persian poetry begins more or less from this date.***
Key word: ***Modern era, Persian Poetry***

National awakening and western influences have been the most active factors in shaping this poetic literature as a result of the political change in 1906, the court had suffered a serious setback in the loss of its former prestige. In addition, a newly awakened sense of nationalism had brought into being the concept of the" common man" and society had replaced the individual under these altered circumstances. The poet was faced with demands which could not be satisfied by traditional poetry, for, in the words of well-known contemporary poet 'Arif Qazwini' "it is not possible that the sentiment of those who belonged to an early period and whose arts and sciences were limited and restricted should be the same as those of persons both in the eighteenth and nineteenth centuries, which were times of national awakening, the emergence of arts and sciences and also of political revolutions, because every period has a certain feeling and every feeling as an interpretation. And if the literary school is not under the law of social evolution, that is to say the latter is active, the course of natural development is subject to imperfection''.

However to bring about a change, it was necessary to acquaint Persian poetry with such values as would be able to stand against those of the past. The Arab conquest of Persia not only did affect the material conditions of the country, but had also deep impact on the intellectual climate. Due to the influence of Arabic, the Persian language had acquired a new look, and poetry, as for as its form was concerned, had borrowed extensively from Arabic ,while its content had been vitally affected by the religious ideas of the conquerors, which is illustrated by the sufistic trend in Persian literature. The influence which western ideas exercised upon the Persian mind in the 20th century was

nearly a significant. Despite the fact that Persian poetry, in its state of decline, presented a picture of stagnation and poverty. Through the reforms of RIZA SHAH inside the country there had appeared an enlightened class which, learning from the experience of the west sought to acquaint its own people with new ways of life.

Increasing facilities in education gave impetus to this sentiment. Educational institutions began to grow rapidly in the time of Riza Shah, and the Danishgah-I Tehran was founded in 1935. The developments which took place after the 2nd world war brought Persia closer to the west. Western literary influences began to find their way into Persia from the 19th century mainly through translations. But on the one hand, such early attempts were comparatively limited in number and on the other hand, the choice of books did not conform to any set standard. After the 2nd world war high attention was given to the work of translation by rendering western classics, both ancient and modern, into Persian. Thus there exist a number of Persian translations from Greek, Latin, French, German, English, Russian and Scandinavian literature. The tendency has been further popularized by the literary journals, among which the SUKHAN may be especially mentioned for its leading role in acquainting the Persians with modern literary trends in the west.

The political and cultural influences have given a new direction to poetry. If classical verse was dominated by eulogy and mysticism, the present trend has been to seek inspiration from experiences of a broadly social and intimately personal character. It is true that there is an inclination to resist drastic changes and radical innovations-a fact partly borne out by the widespread use of classical forms –yet signs which a reaction against excessive traditionalism have already begun to appear. The younger generation is especially vocal in demonstrating its dissatisfaction and under the impact of modern European literature, has endeavored to introduce unconventional modes of thought and expression. In short, modern poetry reflects a struggle between the old and the new, similar to the antagonism present in the Persian society, the outcome of which remains yet to be seen. According to the Wahid Dastgardi, the poets who, under the influence of English and French literature, seek to introduce innovations in form cause damage to poetry because, as he seems to imply, it is only ideas and themes which determine novelty.

AS J.M Balfour rightly points out, “The Persian constitution may be fairly said to have come into existence, not as the outcome of any sustained and national demand but almost by accident. The people, generally speaking were not interested and more than they are to-day. Under these circumstances there is a justification for the exaggerated tone of despair which modern Persian poetry reveals.

Bibliography

1. Post Revolution verse: Institute of Islamic Studies, 1955.
2. Kulliyat-i Mirza Arif Quzwani, (Tehran), pp. 25.
3. Kulliyat-i Mirza Arif Quzwani, pp. 26-27.
4. Wahid Dastgardi, Armaghan 18 ii May 1937, pp. 85-86 and iii june 1937, pp. 168-169.
5. Lutf, Ali Suratgar. pp. 136.
6. Recent Happenings in Persia (Edinburgh, London 1922) pp. 54.

Arshi Naaz
Research Scholar, Department of Philosophy
Aligarh Muslim University, Aligarh

AN ISLAMIC PERSPECTIVE ON FREE-WILL

Abstract: ***There are verses in the Quran which defined God to be All-Powerful and Omnipotent. There are other verses in the Quran which categorically bring out human will to be free, thus making man responsible for his actions and accountable to God on the Day of Judgment. The present papers cites both kind of verse from the Quran. It refers several sermons of Hazrat Ali which under line freedom of Human Will. The paper are refers to Maulana Rumi's espousal of human free will. A summary of Iqbal's perspective on free will is also advanced. Iqbal's seems to be clinching the issue of free will and determinism. He suggested that freedom cannot afford to man on a platter. Man has to face challenges and overcome them. The more one over comes challenges, the greater levels of freedom one earns.***
Key Words: ***Islam, Freewill***

The problem of 'free will and determinism' has especially powerfully challenged the world-views advanced by monotheistic religions. According to monotheistic religions God who is Eternal, Universal, Transcendental, Infinite and All-pervading, is the Originator, Creator, Sustainer, Master and Lord of the universe including man. He has sent Prophets with scriptures for the guidance of man. As and when God deems fit, He will establish the Day of judgment delivering justice to all human beings; sending all righteous people to paradise and vicious people to hellfire.

In the context of such a world-view, man is deemed to be both rational and responsible. He is a rational subject and a free moral agent. However, in the Biblical and the Quranic Scriptures, God is All-Powerful as well. Now the philosophical question arises as to whether man is really free in the face of All-Powerful God. The Quran, for example, advanced verses supporting both the All Powerful role of God and moral accountability of man. In view of the same, Muslim philosophers have taken divergent views with regard to divine supremacy and human responsibility. There are philosophers who underline All-Powerful Character of God and others who emphasize on human free will and responsibility. For example, Mutazilite philosophers advanced the view that man is given a free rational personality to do certain things and avoid doing certain other things. Any project, undertaking or initiative is taken up by man and worked in course of time to completion. Any programme of action originates in man and other things remaining the same, is accomplished by man through requisite struggle.

History of mankind is a ceaseless quest for freedom. It is a multipronged quest; freedom from want, from fear, from forces of nature from tyranny of

fellow beings, from injustice, from superstitions, from prejudices, from tribal and racial loyalties and ultimately from his own egocentric existence. Man passed gradually through various stages of realizing all these freedoms. Sheer material freedom means nothing unless it brings in its wake spiritual freedom also. Rather both of them are complementary to each other and are organically inseparable. The quest for freedom sufferd setbacks and reverses whenever any one of the two was neglected. The modern civilization suffers from the malady of overemphasizing the material dimension of freedom totally or partially neglecting the relevance of spiritual freedom to human existence. Religion has been striving for mans, spiritual freedom, while philosophy has been interested in realizing both of them at a different plane. Science and technology's quest has been always directed toward's attaining material freedom. All human evolution represents a course of gradual realization of various types of freedom. Human evolution is creative evolution in the sense that at, its every stage a higher from of freedom emerged as a result of man's creativity. Human evolution is different and distinguished from biological evolution, for the Latter is mechanical and deterministic as compared to the earlier in which man's aspiration for freedom plays a vital and decisive role.

In the course of man's creative evolution Islam emerged as an embodiment of all kinds of freedom, at a stage when humanity was in need of a balanced synthesis of material and spiritual freedoms. Islam emerged at a stage when material advancement was still in embryo. It anticipated rapid future developments in material sphere, which required Divine spiritual guidance in pursuing the right path for future development of human society and polity. It is in this sense also that Islam ensures eternal guidance, for it took in its stride all past freedoms attained by man and laid down a plan of future evolution. At that stage human mind was incapable of embracing infinite future possibilities of human creativity, because it had not yet developed the intellectual and empirical tools required for unseen future. The Quran, last of Divine revelations, contained the guiding principles of scientific induction as well as a moral code that could suffice for man's socio-political and economic advancement, ensuring maximum freedom of human action in all the spheres of man's multiphronged quest for freedom. The Quran's declaration that God has completed His message(Din) and has conferred upon man the best of His rewards points to the fact that through Islam man attained the utmost potential to realize his freedom.

"God does not saddle a self with obligations beyond his capability'', declares the Quran. This principle is applied to different individuals in different degrees. Obligation implies inherent ability to fulfill it, provided a man is willing to shoulder it. All Divine Commands and Prohibitions presume that man has ability to follow them and that some of them shall obey, while others shall disobey. The possibility of obedience and disobedience rises out of human freedom. As everybody acts according to his own will without any compulsion from outside, one is liable to reward and punishment according to his deeds. We have to accept that God never imposed a fixed predetermined nature upon any individual, and it is man himself who chooses and moulds his own nature, and accordingly his destiny in this regard. Without allowing for mans, freedom of

choice and action, there could never arise the question of reward and punishment, which would have amounted to arbitarianess, that is injustice, on the part of God.[1]

If one simply goes through the verses of the Quran one will find both types of verses, one group of verses stressing upon human freedom and the other emphasizing on Divine Sovereignty. On the one hand, it is mentioned in the Quran that:

"Lo! Allah is able to do all things."[2]

"And He is able to do all things."[3]

"Unto Allah (belongeth) whatsoever is in heavens and whatsoever is in the earth; and whether ye make known what is in your minds or hide it, Allah will bring you to account for it. He will forgive whom He will and He will punish whom He will. Allah is able to do all things."[4]

"Allah is Mighty wise."[5]

"Neither those who disbelieve among the people of the Scripture nor the idolaters love that there should be sent down unto you any good thing from your Lord. But Allah chooseth for His mercy whom He will, and Allah is of infinite bounty."[6]

"Allah createth what He will. Lo! Allah is able to do all things."[7]

"For thy Lord is ever powerful."[8]

"Say O Allah! Owner of Sovereignty! Thou givest sovereignty unto whom Thou abasest whom Thou will. In Thy hand is the good. Lo! Thou art Able to do all thing."[9]

"He forgiveth whom He will, and chastiseth whom He will. Allah has the Sovereignty over the heavens and the earth and all that is between them, and unto Him is the Journeying."[10]

On the other hand, one also clearly finds in the Quran that God (Allah) has given man freedom and power. The Holy Book vividly indicates that:

"Lo! Allah changeth not the condition of a folk until they (first) change that which is in their hearts."[11]

"And that man hath only that for which he maketh effort."[12]

"Whoso Committeth sin Committeth it only against himself."[13]

"And forsake those who take their religion for a pastime and a jest, and whom the life of the world beguileth. Remind (mankind) hereby lest a soul be destroyed by what it earneth."[14]

---

[1] Allamah Iqbal, The Reconstruction of religious Thought in islam, (Lahore, Sh-Muhammad Ashraf, May 1971) p.111.

[2] Al-Quran, (11:20) English Translation from "The Meaning of The Glorious Quran" by Marmaduke Pickthall, Delhi, Taj company, Edition, 1993.

[3] Ibid, XXX: 50

[4] Ibid., 11: 284

[5] Ibid., 11: 228 & 240

[6] Ibid., 11: 105

[7] Ibid., XXIV : 45

[8] Ibid., XXV : 54

[9] Ibid., 111 : 26

[10] Ibid., V :18

[11] Ibid., X111 : 11

[12] Ibid., L111 : 39

[13] Ibid., IV : 111

"So whosoever is guided, is guided, is guided only for (the good of) his soul, whatsever erreth, erreth only gainst it. And I am not warder over you."[15]
"So Allah surely wronged them not, but they did wrong themselves."[16]
"There doth every soul experience that which it did aforetime, and they are returned unto Allah, their rightful Lord, and they which they used to invent hath failed. Them."[17]

There are innumerable verses on human freedom in the Quran. We have quoted above a few by way of illustration.

The Prophet (A)} struck a balance between the two extreme positions. In the light of vast Hadith literature one is easily led to the conclusion that the question of human freedom is not a simple one. The Prophet (A) is reported to have forbidden the Muslims to indulge in this controversy. However, the problem, when raised by some groups of the Muslims during the Caliphate of Imam 'Ali (A), elaborate lectures on this issue were delivered by him, as we may find in Nahj al- Balaghah. A few examples of Ali's treatment of the issue of freedom may be quoted here:

'…They had been allowed time to seek deliverance, had been shown the right path and had been allowed to live and seek favours, the darkness of doubts had been removed, and they had been let free in this period of life…'[18]

'…O' People who possess eyes and ears and health and wealth…The present is an opportune moment for acting. O' creatures of Allah since the neck is free from the loop, and spirit is also unfettered.… You have opportunity of acting by will…'[19]

The notion of freedom of human will is repeatedly emphasized and radically elaborated in many Sermons (khutbat) Letters and Sayings of Imam 'Ali' According to him God has bestowed upon man wisdom, knowledge and power to act freely. He will be rewarded for his good deeds and punished for evil ones-whatever he does, he is responsible, for God has given him freedom.To substantiate the above mentioned points, a few more relevant passage from Nahj al-Balagah may be given here.

'…. You will be dealt with as you deal with others, you will reap what you sow and what you send today will meet you tomarrow…'[20]

"Allah has clarified to you the way of truthfulness and lighted its Paths. So (you may choose) either everpresent misfortune or eternal happiness …. Know, O' creatures of Allah, that your ownself is a guard over you."[21]
"Allah has sent down a guiding book wherein He has explained virtue and vice."[22]
"No doubt Allah sent down the Prophet as a guide with eloquent Book and standing command. No ones would be ruined by it except one who ruins himself."[23]

---

[14] Ibid., VI : 70
[15] Ibid., X : 108
[16] Ibid., IX : 70
[17] Ibid., X : 30
[18] Nahjul al Balaghah of Hazral 'Ali, (English Translation) Qum: Iran, Ansariyah Publication, 1401 A.H. (1981 A.D) P.155, (Sermon : 81)
[19] Ibid., P. 159, (Sermon : 81)
[20] Ibid., p. 254, (Sermon: 151)
[21] Ibid., pp. 261-62, (Sermon: 155)
[22] Ibid, p. 278, (Sermon : 165)

Maulana Jallaludin Rumi has also deliberated on this controversy among Muslim philosophers. According to Rumi in the creation of God only man is endowed with freedom of choice. It is only this endowment which makes him the paragon of creation. There are things that are unalterable and there are things that are alterable. It is only laws of God that cannot be changed. Individual choices of human beings are not predestined. Man is always deliberating between possible alternatives, he ponders over alternatives that are equally open to him. His deliberation is a proof of his freedom. He deliberates as to whether he should go to Damascus or remain at Bagdad but he does not deliberate as to whether he should walk on the earth or fly in the skies.

Human Ego, according to Iqbal, is blessed with freedom of world-shattering , world-shaking and world- civilizing significance. However, it is through facing pain, suffering, evil, as forces of resistance and circumstances and conditions or forces of obstruction in so for as they pose a challenge to his personal projects that human beings are tested. If man surrenders to obstructions, he can be said to be fully determined in the face of natural or institutional impediments. However, if he choose to confront the ongoing and upcoming impediments, he can put himself on the track to realizing as well as earning his freedom. Human beings earn freedom after putting up a no holds barred struggle. The more we overcome obstacles, the more we can feel the growth of our freedom.

Apparently man is determined by natural, historical, social, psychological and genetic factors. However, this determination or control of human freedom is not absolute or unqualified .These determinations only mark off the field of human operations and endeavors. They also prescribe the methods of human operation. When man boldly and with intelligent and purposeful creativity strategises, his steps and methods of intervention , the environing conditions are substantially changed or drastically recast in furtherance of his desires and aspirations and values and ideals. The self has to engage with his obstructing environment with maximum possible dexterity, ingenuity and creativity. Only by responding to environing challenges and conditioning imperatives with sufficient or maximum creativity can we extend the frontiers of our freedom. Thus ever-widening freedom of the human ego finally synchronises with Divine freedom.
Man becomes a co- worker with God. However, given the imperatives and parameters of human ego, man is ever liable to lapse into unfreedom, surrender and helplessness. Islam has, accordingly, prescribed rituals and prayers throughout day and night, with a view to perennially reconnect man with God. Prayers at regular intervals restore or increase human freedom by bringing ego into closer touch with the ultimate source of life and freedom.

[23] Ibid., p. 279, (Sermon : 166)

Shamim Ahamed

Research Scholar,

Department of Arabic, Persian, Urdu & Islamic Studies

Visva Bhharati , Santiniketan, India

The Asiatic Society and William Jones: A Brief Survey

Abstract: ***The colonial interests of the British then formulated the then India's Educational Policy. After Regulating Act of 1773, the Governor of Calcutta was called the Governor- General and was given supervisory power over the Governors at Bombay and Madras. In 1765, the East India Company established their ruling power in Bengal. However, the Indian officials of the East India Company called on the Director's Court to do something to learn oriental. The company's government creates some half-hearted efforts to develop eastern education. In the 18th and 19th century Calcutta was important city of Bengal which witnessed the development of Persian language and literature. The Asiatic society was leading center of Persian studies and it encouraged expatriate administrative classes and some scholars both native and European to learn Persian. In a way this also provided great encouragement and inducement to many Indian historians and litterateurs to study Persian for consulting original source materials lying in the form of many manuscripts in the Asiatic society. The Idea of forming Asiatic Society came into the mind of Sir William Jones who came to Calcutta (Kolkata) in 1783 as Puisne Judge. All the orientalists who became famous in history became clusters around this society. The Society was certainly pioneering and the first in the field, while others were thinking about separate study and research, Sir William Jones was the first person to think a permanent institution for oriental research and a great scale in this country.***

Key words: ***pioneer, manuscripts, oriental, administrative***

The idea of forming Asiatic Society came into the mind of Sir William Jones (1746-1794) was a poet, philosophy. polymath, polyglot, acknowledged legislator, a foremost orientalist and one of the greatest intellectual navigators of all time, who came to Calcutta (now Kolkata) in 1783 as Puisne Judge of the late Supreme Court at fort William college in Bengal. The Society was certainly pioneering and the first in the field, while others were thinking about separate study and research, Sir William Jones was the first person to think a permanent institution for oriental research and a great scale in this country. While on a long trip to Calcutta, Jones had

thought about the use of a huge geographical spread of the language related and other research and colonial conditions, which was a little known by the scholarly world. He took the initiative and in January 1784, sent a circular to the electorates for the purpose of establishing the Society for the purpose. In response to his letter, thirty European gentlemen of Calcutta including Mr. Justice John Hyde, John Carnac, Henry Vansittart, John Shore, Charles Wilkins, Francis Gladwin, Jonathan Duncan and others gathered on 15 January 1784 in the Grand Jury Room of the old Supreme Court of Calcutta. Chief Justice Sir Robert Chambers chaired the first meeting and Jones gave his first speech which he presented his plans for the Society[1]. Only a well organized integrated investigation will prove its inadequate effort without a traditional research organization in its own dynamic effort. William Jones, however, was not the first among the Orientalists of East India Company to reach India. Almost a decade ago, Charles Wilkins (1770) Nathaniel Brassey Halhed (1772) and Jonathan Duncan (1772), Warren Hastings, were bright young people who had paved the path of the two future institutions like Asiatic Society and the College of Fort William[2]. There were four types of members of Asiatic Society; They were foundation Members, ordinary members, honorary member and corresponding members. There were chairs of President, vice president and treasurer as well. The works may be noticed under two heads 1st semetic and 2nd Sanskritic. The semetic series included besides some standard law books in Arabic, all the standard works in Persian. At the beginning of the Asiatic Society Library, there was four thousand three hundred seventy nine Persian manuscripts. In the last of 1958 and in the beginning of the year 1986 there was addition of hundreds of Persian manuscripts were given by the Rakhkanta Deb Rai Library, Shobha Bazar (Kolkata). Therefore the number of Persian manuscripts rose to four thousand three hundred and Nineteen. As the coin of different period have been kept separately so the epistles of the Sultans and the Kings have not been placed. The Dare-ul-Insha as the department of official and diplomatic correspondence has always been one of the principal organs of the chancellor under Muslim political organization. To get service in the department of Dar-ul-Insha, It was necessary for the persons to be well versed in the art, of epistlography[3]. The book on epistlography of Md Saleh Kanbu, the Amal-i-Saleh is preserved in manuscript form in the Kanbu library of the Asiatic Society. Besides Insha' Containing official documents and epistles In the name of the following may be mentioned-

1. Insha-i-Murwarid 2. Manshatat-i-Madhuram, 3. Manshatat-i-Mahrau. 4 Insha'-e-Qasim Tabsi 5. Man sha' at Abdo-w-Lauf. 6. Majmoo -a -

[1] Dr. Momin Mohi-u-din, the Chancellery and Persian Epistlography under rhe Mughals, Cal, P-VII

[2] Obaidah Begam, Fort William Kalej ki Adabi Khidamt, P-40

[3] Mohammed Saleh Kambu, A'mal—i-Saleh, 1912, Calcutta pp-303,

Maktoobat 7. Adabsir Alamgiri. Majmu'asii Makatib 8. Iilsimatimula Kheyalat.

From the above epistles it can be safely said that there are huge collections of letters in the Asiatic Society Library. Four years after the establishment of Asiatic Society, the Asiatic Research Journal came out in 1788, containing the selected articles. The first Persian version of English article was seen in the first of the journal under the title of on the trial by ordeal among the Hindus of Ali Ibrahim. After the publication the article of William Jones on the Usage of Arabic words in Persian was published under the title of the introduction of Arabic words into Persian. A total number of 20 volumes of Asiatic Research were issued[4]. It ended in 1839 A.D. The following articles have been published in addition to.

I. *Descent of the Afghans from the Jews in English in volume II of Henry Vansittart. The article in English was based on the book "Israra-u-Afghana prepared by Moulvi Khair-ud-Din in Poshtu.*

II. *Henry Vansittart translated some paragraphs of Alamgir Namah of Mohammed Khan belonging to Assam.*

III. *The English translation of an article, An accent of the battle of Panipat and the events leading to it." was published. It was translated from the Persian book of Kashi Raza Pundit.*

IV. *In the third volume William Jones wrote an articles "on the Mystical poetry of Persian and Hindus in English.*

V. *On the pillars and minarets of Feroz Shah in Delhi there are Persian inscription which were translated by Henry Cole Brooke and it was published along with introductory notes of Haringtonin in the seventh volume of Asiatic researches.*

VI. *An article of Francis Belfor consisted of the paragraphs Tahziba-ul-Mantiq was published in the eighteen volume. The article was written as an appendix to the Arabic and Persian.*

VII. *The translation of two epistles of Nadir Shah in English was published in the 10th volume by John Malcon with the intro notes regarding the epistles of Nadir Shah.*

VIII. *Regarding Roshniya Firqah and its founder Bayazjd, an artifice of J Leydon was published.*

General Captain JD Herbert founded a monthly issue named 'Gleaning in Science. It was limited to European scientific articles. On March 25, 1784, the library received seven Persian manuscripts from Henry Richardson. The library received the Surveyor-General colonel Mackenzies collection of manuscripts and drawings in December 1822. Manuscripts

[4] Ibid 306,

collection of the Society is varied and rich, and covers most of the Indian languages and scripts and even several Asian ones e g. Assamese, Bengali, Gujarati, Gurumukhi, Kanarese, Urdu, Marathi, Modi. Nagari Newari, Oriya, Rajasthan'. Sarada, Armanian. Sinhalese, Arabic, Persian, Pushto, Javanese, Turki, Burmese, Chinese, Siamese, Tibetan etc. The materials used for the manuscripts are also varied: Palm and palmyra leaves, barks of different trees, papers of various grades. The manuscript of the most notable of them (man, a Gulistan text, and a manuscript of Padshah Namma, bearing the signatures) is a sculpted manuscript. (4) The society has received the entire Palace Library of Tipu Sultan, with thousands of manuscripts including original manuscripts various books from many private and primary collections of Fort Williams College and its members and others. Now there are about sixty thousand manuscripts of the Society in four sections Sanskrit, Perso-Arabic, Sino-Tibet and English. At present, the Library of Asia Society has circulated about one lakh seventeen thousand books and seventy nine thousand journals printed in almost all major languages of the world. It is a collection of two hundred ninety-three maps, forty eight thousand of microfiche, three lakh eighty seven thousand three pages one hundred eighty two painting and two thousand five hundred pamphlets and photographs. In the Persia-Arabic section, there are more than four thousand manuscripts in Arabic and with two thousand six hundred manuscripts in Persian, some are very rare with the complete set of the Asiatic Society of different countries around the world[5]. The library of Asiatic Society is perhaps the richest repertory in Arabic and Persian literature, both printed and manuscripts. As previously printed out, some manuscripts are so rare that the scholars around the world come here to read them. There are many Islamic manuscripts that are very rare and unique. There are a large number of enlightened and illustrated manuscripts in various schools, most of which are unique to their Calligraphy. Their lines are delicious, and elegance of composition and charming colour schemes. This manuscript still holds a glimpse of India's past achievement. Of these unique manuscripts (earliest belonging to the 10th century A.D) few may be mentioned:

Astasahasrika Prajnaparamita, Aparimitayurnama Mahayana Sutra, Paramarthanama Sangati, Devimahatmya, Viveka panchamrita, Bhagavatgita, Shahnama. Kulliyal-i-Saadi, 'Ain-i-Akbari", "Diwan-i-Makhti, Qissa-i-Nush -Afarin , Jamiut-Twarikh', Amir nama Tutinama, Iyar-i-Danesh', 'Bihar-i-Danesh, Tarjuma Mahabharata, Tafribul Imarah' (by Silchand, dedicated to JH. Lushington) and lmaratu -Akbar (by chitarmal for James Duncan).

The Society has find a collection of about two hundred thirty four Urdu manuscripts, many of which received as a gifts from the Fort William College. James Principe took the responsibility of gleaning the monthly journal of science and mentioned it in the Journal of Asiatic Society. He got

[5] Ibid 307

emission to bring out in the name of "The journal of the Asiatic Society in 1832A.D. Very soon it became popular when the Asiatic Researches came to stop all its article began to get published in "The journal of the Asiatic Society" when Henry Torrens resigned from the post of secretary. In 1824, questions related to the editor were raised. The Asiatic Society accepts all the responsibilities of the journal. Asiatic Researches the publications of the articles on the Persian subjects started in the journal of the Asiatic society. The articles which are written in the century, some of these are as follows:

The publications of the Asiatic Research articles on the Persian subjects started in the journal of the Asiatic society'. The articles which are written in the century, some of these are as follows:

I. *Robert Leech translated the Safar Namah of Agha abbas Shirazi and published in the journal of 1843 A.D.*

II. *Robert translated the Safar Namah of Haji Abd ul. Nabi and was published in the journal of 1844 A.D.*

III. *William Anderson translated the article of Ibn Hawkal in connection with Sistan and was published in the journal of 1852.*

IV. *William Anderson translated an article of Ibn Hawakal about Khorasan and was published in the journal of 1884 A.D.*

V. *John Beams wrote an article the Geography of India during the rule of Akber and was published in 1884 A.D.*

VI. *An article on Khurshid Janan Numa of Saiyyaid Elahi Bakhsh was translate by H. Beveredge and was published in the journal of 1895 A.D.*

VII. *In the journal of 1867 AD, on the basis of the Persian Manuscripts Tarikl-i Minuchihri an article on serai-ud-Daulah and his city Murshidabad was published.*

VIII. *In the journal of 1868 AD, an article of Blochman on the Persian Lexicon was published.*

IX. *In 1869 on Badayuni and his contributions an article of Blochman was published.*

X. *In the journal of 1872 in th light of Akbar Namah Padsha Namah Fatahai Asam Ibriya an article on the sixteen and seventeenth century Cooch Bihar a was published.*

XI. *A note of Blochman on the unpubished Ghazals of Hafiz was published in the Journal of 1877 A.D.*

XII. *Ocland calivin translated the part of Tarikh i Ferozsahhi of Diya-ud-Din Barani containing the rule of Gheyath-ud-din Tughlaq-shah was published in the journal of 1871A.D.*

XIII. *An article on the Qinna-us Saadain was published in the journal of 1806 A.D.*

XIV. Narsinha Dutta translated the part of Zafar Namah containing the dialogue between Bujur Jamahar and Aristltle and was published in the journal of 1851A.D.

XV. Some parts of Tarikh -i-Feroz Shahi were translated and published in the journal of 1869 A.D.

XVI. Some modeles of decoration of Persian composition were presented by Maharaja Kali Krishan Bahadur in the journal of 1883 AD.

XVII. In the Journal of 1836 an article about heart was written by Munshi Mohan Lal.

XVIII. From the third volume of Aina-i- Akbari an article on the Government of Multan, was written by E.D. Macklagan and was published.

XIX. H.G. Raverity wrote an article regarding the relation of origin of Afghans, their language and Zand Pahalavi and Ibrani with pshtu and was published in the journal of 1854 A.D.

XX. H.G. Raverity published the footnotes of the author of Tabaqat-i-ANasiri in the journal of 1855A.D.

XXI. P. Whalley translated some chapters of Tarikh-i-Feroz Shahi containing the matter about the rule of Moaj-ud-Din in the journal of 1871 A.D

XXII. CE Yat wrote an note on the city Heart in the journal of 1887 A.D.

Harry Torrens literary editing, entitled Rakh-e-Nadir, was the only Persian book to be edited. Asiatic Society was determined to publish Oriental books or their translations through the Biblotheca Asiatica 1806, and sought help from translators and calligraphers. The dreams of publication was implemented in 1847, instead of Bibliotheca Asiatica, through Biblolocha Indica. Asiatic Society seeks financial support from government and book publishes. The British government stopped publication under its language-based policy. When we authorized the appropriation of a society Grant to the encouragement of India Literature we had in view specially the literature of the Hindus although we did not propose to exclude Mohammaden literature of local origin or interest such as the historical works epitomized by Sir Henry Elliot but we certainly did not contemplate a voluminous and costly publication of the theology and tradition and spiritual mysticism of the Muslim which is the literature of Arabs and not at all that of India. Therefore, it has been instructed to stay here after posting the encouragement of such works[6]. The publication that have been commenced may be competed but upon their completion we expect that the Asiatic Society in applying part of funds placed at its disposal to Arabic or Persian works will have regard to the light which they are calculated to throw not upon the literature or theology of Arabic but upon the literature and history of

[6] John Herbert Harington (1764 -1828) who eddied the Persian and Arabic works of Saadi.

Indian[7]. As a result the work of publishing the following Arabic and Persian books came to stop:

1. Fatawa -i Alamgiri (6 volume) 2. Anayah (4 Volume) 3. Khazanat-ul-ilm (620) 4. Jawam'ul Illm-ul-Reyadi 5. Anisul Mushrahin 6. Aljabr -o- Muqabalha

Under the service of Bibliotheca Indica, Persian texts and English translations of the text were published in the 19th and 20th centuries[8]. Below is a specific material from books published in the 19th Century by Asiatic Society, with which the contribution of society to Persian literature is easily estimated.

S. N.	Name of Book	Author	Edited or compiled	Year
1	*Sikandar Namah Bahri*	*Nezami*	*Springer and Agha Ahmed Ali*	*1852 -69*
2.	*Tarikh Feroz Shahi*	*Dhiya-ud-Din Bari*	*W.N Lees, S. Ahmed Khan and Kabir uddin*	*1860 -62*
3.	*Tarikh-i-Behqi*	*Abul Fadl Baihqi*	*W.H Morley*	*1861 -62*
4.	*Tabqat-i-Nasiri*	*Abu Omer Uthami (Minhaj Seraj)*	*W.N. Lees Moulvi Khadmi Hosain and moulavi Abdul Hai*	*1863 -64*
5.	*Wais –o- Ramin*	*Fakhr ud-din*	*W.N. Lees*	*1864 -65*
6.	*Muntakhab ul Tawarikh*	*Abdul Qadir Badayuni*	*W.N. Lees Kabir – ud-Din and Ahmed Ali*	*1864 -69*
7.	*Iqbal Namah Jahangir*	*Moaamid Khan*	*Moulavi Abdul Hai and Moulvi Ahmed Ali*	*1865*

[7] Asiatic society Bengali Media on line
[8] Proceding moth of August, 1856A.D

8.	*Alamgir Namah*	*Md. Kazim bin Amin Munshi*	*W.N. Less Moulvi Khadim Hosain and Moulvi Abdul Hai*	*1865 -73*
9.	*Ain-i-Akbari*	*Abu Fadl Allami*	*H.B Blochman* *(Edited)*	
10	*Ain-i-Akbari*	*Abu Fadl Allami*	*H.B Blochman (translated vol. 1) S.H. jort* *(Translated volume II)*	*1868-94*
11.	*Muntakhab –ul Lubab*	*Khan –i-Khnnam*	*Kabir ud –din Ahmed ,* *Ghulam qair (edited Volume I &II)*	*1868-1925*
12.	*Mathir Alamgiri*	*Saqi Mustaid Khan*	*Ahmed Ali edited*	*1870-73*
13.	*Farhang-i-Rasheedi*	*Adbul Rasheed Tutwi*	*Dhulfiqar Ali*	*1870-75*
14.	*Akbar Namah*	*Abu Fadl Allami*	*Ahmed Ali Abdur Rahim*	*1873-86*
15.	*Tabqat Nasiri*	*Abu Uthman Minhaj Seraj Gurgani*	*H.G. Raverty (Translated into English, Part I, II and Index)*	
16.	*Haft Asman*	*Ahmed Ali*	*H. Blochman Edited*	*1873*
17.	*Muntkhab ul Tawaikh*	*Abdul Qadir Baayuni*	*Translated in English volume I*	*1884-1925*
18.	*Zafar Namah*	*Sharf-ud Din Ali*	*M. Elahi Dad.,*	*1855-1888*

	Tarik –i- Taimur	*Yazdi*		
19	*Mathir ul-Omra*	*Shahnawaz khan*	*Adur Rahim & Asjraf Ali (edited three volume)*	*1881-91*
20.	*Tarikh –i-Feroz*	*Shams seraj Aqisat*	*Wilayat Hosain*	*1888-91*
21	*Turz –i-Jahangir*	*Moatamid*	*H.W. Lowe, translated into English*	*1889*
22.	*Reyad -us-Saltain*	*Gholam Hosan*	*Abdul Haque Abid*	*1890-98*
23.	*Akbar Namah*	*Abdul Fadl Allami*	*H.W Vewning*	*1897-1939*

Jones had personally shown the value of a language study of the world, as a scholar or as an educationist by language-based learning, teaching, improving and providing entertainment[9]. His language-based career helped extensively as a model for America and Europeans by the end of the nineteenth century. In his Persian and Sanskrit studies, cultural and political outcomes, beyond the scholarly verses for the Indian public, are always enlightened for the practical purpose.

Bibliography:

1) Asiatic Society, Calcutta. Index to the Publications of the Asiatic Society, 1788-1953.
2) Chaudhari, Sibdas, Bibliography of Indological Studies in 1953, Calcutta, Asiatic Society, 1958
3) Chopra R.M., The rise, growth and Decline of Indo-Persian Literature., Kolkata Dec.2011.
4) Datta, B.K., Libraries and Librarianship of ancient and medieval India, Delhi, Atma Ram & Sons, 1970, Pp. VI+248.
5) Mitra, S.K. (1974). The Asiatic Society, Calcutta: The Asiatic Society.
6) Ram Prakash, Comp., Directory of Educational Institutions, Calcutta, R.P. Bookwala& Co., Pp. 386.
7) Indo-laranica — Volum fifty six, March, June, September and Dceember-2013 Number 1 to 4.
8) Journal of the Asiatic Society of Bengal, 1844, Vol.-13

[9] Sarswati, H.D Swami Prakashanand, The true History and the Religion of India, pp 297

Sk. Kutubuddin
Researh Scholar,
Dept.of Arabic, Persian & Urdu & Islamic Studies,
Visva-Bharati, West-Bengal

Translation of Indian literature in Persian

Translation, right from the time of its inception, is a project of cultural domination and was conceived and executed by the colonial rule in order to substantiate its political interest. Whether it is translation of the law texts or the classics, notion such as the original text, interpolations, different receptions, the accuracy of translation, the chronological ordering of the text, thereby, implying the influence of one over the other are some of few the problem that one confronts in the field of textual criticism and translation.

Persian, no doubt made far-reaching impacts on Indian language and at the same time made no hesitation in adopting words and phrases from Indian languages especially Hindustani. The Indian writers who ventured to write Persian prose or compose charming verses willy-nilly used Indian vocabularies and gave an Indian flavor to Persian, which, in the sixteenth and seventeenth centuries, had a hue of its own, quite different from that of Iranian Persian.

Amir Khusrau has been regarded as the greatest Persian poet of his age and is said to have written more than four lakhs of couplets. He wrote a number of prose books also, most famous of them being the Khazain-ul-Fatuh, Tughlaq - nama, and the Tarikh-i- Alai. A large number of scholars flourished at the courts of provincial rulers as well. Sayyid Muin- ul- haq was famous in Sindh, Ibrahim Farukhi flourished in Bihar and Fazlullah Zain-ul-Abidin was a scholar of Gujarat. Translation of certain Sanskrit books was also done in Persian language during this period.

The work of Hasan (c.1252–1337), a friend of Khusrau, was praised by Jami, the great Persian poet, a rare distinction for an Indian writer. He wrote prose as well as verse, and his *Fawaid-ul-Fuad*, a record of the table-talk of his spiritual guide, Nizam-ud-din Auliya, is a literary classic. Equally interesting,

though not so well known, was Ziya Nakhshabi (d.1350), who was a master of simple and eloquent prose. His *Tuti Nama* (The Book of the Parrot) was based on a Sanskrit original. It has been translated into Turkish, German, English, and many Indian languages. His other translations include the *Kok Shastra*, a Sanskrit text on erotic's.

As already noted, the rise of regional kingdoms in the fifteenth century played an extremely important role in the dissemination of Islamic culture. One significant feature of this disintegration of the central authority, with its dependence on Persian as the official language, was the rise of regional languages. Hindu kings had given their patronage to Sanskrit as the language of religion and the classics; Muslim rulers felt no such compulsion, and supported the common languages of the people. It was Muslim rulers, therefore, who were responsible for many of the first translations of the Sanskrit classics into the provincial languages. In Kashmir, Hindu literature and philosophy were studied enthusiastically at the court of Zain-ul-Abidin (1420–1470). *Rajatarangini*, one of the few histories written in Sanskrit, was translated into Persian, with a supplement to bring the account up to date. Other works on music and mathematics were composed by Hindu scholars at the Kashmir court. In the south the Muslim rulers of Golconda and Bijapur employed Hindus as ministers, and maintained the state records in the Marathi language. Cultural histories of the various provincial governments are yet to be written, but a similar process was at work at all places.

As a result of cultural exchange on Indian soil, many an author composed Persian *matnawis* based on folkloristic Hindu subjects. Among the early ones, Ḥasan-e Dehlavi wrote the *Esq-nama*, or *Ḥekayat-e ʿaseq-e nagori*, based on a tale from Rajasthan. There are numerous examples in the Mughal age: *Nal o Daman* by Fayżi, taken up from a theme in *Mahabharata, Suz o godaz* by Nawʿi Kabusani (d. 1610), written for Kan-e Kanan in Borhan-pur, and *Rat padam* by ʿAbdul-Sokur Bazmi of Kanauj (d. 1662). From Sanskrit literature many collections of stories were translated into Persian. The Persian model of this genre had, moreover, already appeared in India four centuries earlier: the *Jawameʿ-al-ḥekayat wa lawameʿ-al-rewayat*, completed by Moḥammad ʿAwfi (q.v.) at Iltut-mes's court in Delhi (1228). The *Tuti-*

nama or *Jawaher al-asmar*, of Zia-al-Din Naksabi Badauni (d. 1350) collected 52 cyclic stories on morality arranged on the basis of Sanskrit text. Under Akbar Persian versions of the two great Indian epics were made: the *Mahabharata (Razm-nama)*, and the *Ramayana*. Fayzi (Faezi) was probably the translator of *Kathasaritsagara* (The ocean from the rivers of storytelling), by the Kashmiri poet Somadeva; and the popular *Singhasan battisi* (Thirty-two throne stories) had several versions. In the late Mughal age the didactic tradition of *matnawi* acquired a new philosophical and scientific dimension in Bidel's works (*ʿErfan*, *Ṭelesm-e heyrat*, and *Tur-e maʿrefat*) and later went through Galeb's religiosity (a matnawi on the Prophet Moḥammad's prophethood), culminating finally in Eqbal's matnawis, explicitly inspired by Rumi's *Matnawi-e maʿnawi*, as well as by European literature. His most celebrated work is *Javid-nama*, a journey of initiation into the other world in the form of a matnawi interspersed with gazals.

The Tuzk-e-Babri, or the memoirs of Babur, were translated into Persian by Mirza Abdul Rahim Khan Khana. Abul Fazl translated into Persian many outstanding Sanskrit works, such as, the Kishan Joshi, the Ganga Dhar, the Mahesh, the Mahanand and others. The Mahabharata, Ramayana, Atharva Veda, Lilawati, Rajatarangini was translated into Persian. Abul Fazl translated the Panch Tantra (Anwar-i-Sahili) and Faizi the story of Nal-Damayanti into Persian.

Maulana Ziauddin,the first translator of Tagore's poetry into Persian : 'Sad-band Tagore'. The attempt to translate *Gitanjali* into Persian was, at first confined to a few poems selected from the collection and rendered, along with some other poems of Tagore, into Persian. We know of three such translations, of which two were made in India-one by Ziauddin and other by Tikku-while third one was made in Iran by Pashani. Pashani, he for the first time rendered more than half of the Gitanjali into Persian under the title Nilufar-e-Eshq, which was published at Tehran in 1965. The work presents the Persian translation of fifty seven poems from Gitanjali, with an Introduction containing a detailed account of Tagore's life and work[1].

[1] *For details, see Farhadi, p. 41-42.*

Gitanjali, which consisting of one hundred and three poems in Bengali, was composed by the kavi-guru Rabindranath Tagore(1861-1941) in 1911, and the English translation of which prepared next year by Tagore himself, had earned him the Nobel Prize for Literate in 1913, has ever since been a masterpiece in world literature.

So far as the translation of the whole *Gitanjali* into Persian is concerned, three names appear to be the most prominent Muhammad Taqi Moqtaderi and Hasan Shahbaz both of Iran, and Abduk Ghafur Ravan Farhadi[2] of Afghanistan. The earliest one to translate the whole of *Gitanjali*, from its English version, into Persian prose, was the well known Iranian scholar, Muhammad Taqi Moqtaderi, who had done his doctorate in India and had been the Cultural Advisor of Iran in Afghanistan. His translation was published, under the title *Niyayesh: Gitanjali*, by the information Department of the Indian Embassy at Tehran in 1963.

Abduk Ghafur Ravan Farhadi appears to be the earliest scholar from Afghanistan to present the complete translation of *Gitanjali* in Persian, under the title *Sarudi-e-Niyayesh*: *Git-anjali,* which was first published at Kabul in 1975 and reprinted by the Embassy of the Islamic Republic of Afghanistan at New Delhi in 1998.

The well known Iranian scholar Hasan Shahbaz[3] has presented the translation of whole *Gitanjali* in Persian in his remarkable book on Rabindranath Tagore, which running into 252 pages, was published at Tehran in early 1985. The titile of the book is *Sorudha-ye Sufuyane-ye Gitanjali va moruri dar Zendegani-name-ye Rabindranat Tagur* whichin English means: "The mystical songs of Gitanjali and a study in the biography of Rabindranath Tagore.

Tagore's *Gitanjali* is a perfect of this mystical concept. Those who have read Maulana and Hafiz, can appreciate that the underlying spirit of their poetry can be understood if we were to understand Tagore's words when he writes:

"The infinite personality comprehends the Universe. When our Universe is in harmony with man. It is eternal. We know it is truth, we feel it is beauty, we feel it is love."

---

[2] *Abdul Gafur Ravan Farhadi, Sorud-eNiyayesh: Gitanjali, Kabul,1975,which second edition was brought out at New Delhi in 1908.*

[3] *Hasan Shahbaz Soudha-ye-Sufuyane-yeGitanjali Tehran, 1985*

In the Indian tradition we have an exalted notion of translators. We do not designate Tulsidas, Krittivas, Pampa or Kamban as 'translators' of our great epics but as great poets perse. However, in India, if we leave out the re-telling of the stories of the Ramayana and the Mahabharata in regional languages, the first significant translations, to my knowledge, took place at the time of Emperor Akbar. In his efforts to promote understanding among religions and promote interfaith dialogue, Akbar sponsored debates among scholars of different religions and encouraged the translation of Sanskrit, Turkish and Arabic texts into Persian by setting up a Maktab khana or translation bureau. Persian translation of Sanskrit texts included Ramayana, Mahabharata, Bhagvad-gita, Bhagavat Purana, Atharva Veda, Yoga Vashisht etc. The translations carried out in this phase can be characterised as a dialogue of civilizations. Prince Dara Shikoh (1615-1659), a profoundly learned scholar himself, not only promoted this trend but made it his life-long mission. His interest in comparative understanding of Hinduism and Islam prompted him to take assistance from the Pandits of Banaras with the translation of fifty Upanishads into fluent Persian. It was completed in 1657 and given the title Sirri-Akbar or Sirri Asrar (The Great Secret). This text was translated into English by Nathaniel Halhead (1751-1830) in the colonial period, and into French and Latin by Anqetil Duperron, the famous translator and scholar of Zend Avesta. In the preface to the Sirri-Akbar Dara Shikoh explains how, for some time, he was upset by assertions of radical differences between Islam and the religious practices of the Hindus. He began looking for a common truth between Muslims and Hindus. As Muslims have a revealed Book which determines their world view, he was looking for the divine word in the Hindu religion and thus the translation of the Upanishads came to his mind.

The catalogue of the British Museum gives his full name as Mustafa bin Shaikh Khaliqdad al-Hasami al-Abbasi and writes, "Jahangir directed the present translator to write a more faithful version, in plain and simple language." He later adds that he was selected for the task on account of some translation from Hindu work previously made by him for Akbar[4]. Abbasi is very meager.

[4] *A.J. Arberry: Classical Persian Literature, London, 1958*

However,besides this valuable work, he, at the instance of Akbar, revised the the Persian translation of the Kathasaritsagar with the name of 'darya-i-Asmar. In addition, he, at the instance of Jahangir, translated the Kitabul Milal-wan-Nihal of Muhd. Ash-Sharistani into Persian with the name of Taudihul Milal.

The Persian language and literature continues to preserve its influence in the Indian Subcontinent and the lovers of texts in Farsi look at them as golden sheets of treasure. In the following article we will refer to the extent of interest shown in the prose and verse of Iranian literary figures in the Indian Subcontinent.

Translation essentially entails a word or a sentence being interpreted from one language into another language, which is further governed by the parameters of popularity and understanding. In high-flying and enriched terms of literary works and literature and artistic personas, translation does not only state that they follow a strict sense of interpreting one word or sentence into another language. Translation for authors and writers denote the exceedingly efficient penmanship of a literary body of work, which can be communicated in a written version, from its original language into a secondary or primary one. For instance, in the Indian context, with Hindi being regarded as the official language, several of the English or regional literary works have been translated into Hindi by various esteemed writers. Indeed, translation works in Indian literature belongs to an entirely separate genre, magnifying the forms of literature since the ancient Indian context. Although it may be a common comprehension that translation works of Indian literature is comparatively a recent historical happening, i.e. since the times of British Raj, yet, it is thoroughly an acknowledged factor that Indian works of translation have been an integral part of Indian literature prior to the times of Christ.